ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا تَرجمان

نیا دور

جنوری ۲۰۲۵ء

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

۱۵/روپئے

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ لکھنؤ میں منعقد ''26 ویں بین الاقوامی چیف جسٹس کانفرنس'' میں دیگر ممالک کے رئیس القضات کے ساتھ۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ پریاگ راج سنگم میں پرندوں کو دانہ چُگاتے ہوئے۔

جلد:79 شمارہ:09

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جنوری ۲۰۲۵ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

پبلشر: جناب وشال سنگھ (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب اروند کمار مشر (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

آسیہ خاتون

7705800986

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ:

صبا عرفی:7705800953

تزئین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پکچرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ: ۱۸۰/روپئے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relation Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ	اپنی بات	۲

مضامین

آگ کا دریا کا فنی وموضوعاتی مطالعہ	ڈاکٹر سائرہ خاتون	۳
''لہو کے پھول'' مسائل اور کرب	ڈاکٹر نادرہ پروین	۸
''گیہوں اور گلاب'' کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر درخشاں انجم	۱۲
ترقی پسند ناولوں میں ہیئت اور تکنیک	ڈاکٹر فتح عالم	۱۴
اقبال مجید کا افسانہ ''دلِ چارہ گر'' کا تجزیاتی مطالعہ	اسریٰ بانو	۱۸

منظومات

غزل	جاوید اکرم فاروقی	۱۳
غزلیں	رام کمار/سلیم نایاب فیروز آبادی	۲۰
غزلیں	راحت حسن/فریدہ انجم	۲۱
غزل	مقصود خان علیگ	۲۶
غزل	ایم ایچ تابش رُدولوی	۲۸

افسانہ

میرا گھر کہاں ہے؟	اکمل نعیم صدیقی	۲۲
اپنا اپنا گریبان	فیروز عالم جلالپوری	۲۴
برسات کی دیوی	نورین فیض آبادی	۲۷
ایک ماں ایسی بھی	اُجالا پروین	۲۹

تبصرہ

آتماؤں کے سراب	مصنف: راجیو پرکاش/سہیل کاکوروی	۳۱

ترقیات

بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائیڈز کی ڈائمنڈ جوبلی	ہشام غزالی	۳۲

ماہنامہ نیا دور، information.up.nic.in ویب سائیٹ پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپئے سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسّی روپئے

دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپئے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپئے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای: میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

جنوری ۲۰۲۵ء کا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔

نئے سال کا استقبال

''ماہنامہ نیا دور'' کی اشاعتی تواتر کا یہ سلسلہ میری ادارت میں اپنے پانچویں مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ گزشتہ شماروں کی پذیرائی کافی خوشگوار اور امید افزا رہی ہے۔ 2025 بھی اپنی منجملہ خوبیوں اور خرابیوں کی تمام افراتفری کے ساتھ اختتام پذیر ہوا، اور اسے وقت نے اپنے حافظہ میں ایک تاریخی داستان کی صورت محفوظ کر لیا۔ ہم سب اپنی اپنی زندگیوں کے ایک نئے سال کا استقبال کرنے کے لئے آمادہ ہو چکے ہیں۔ اس اُمید کے ساتھ کہ یہ آنے والا سال ہمارے ملک کے لئے خوشحالیوں اور برکتوں سے بھرپور ہوگا، اور اس ملک میں رہنے والے تمام لوگوں کے لئے خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب و مسلک سے ہو یا کسی بھی قوم و قبیلے، رنگ و نسل یا زبان و بیان سے ہو سب کے لئے بہتر اور خوشیوں سے بھرپور ہوگا۔ اس نئے سال میں ہم سب مل کر ایک نئے بھارت کی تعمیر میں اپنی اپنی حصہ داری مخصص کریں گے۔

گزرنے والا سال اپنے ساتھ ہمارے لئے جہاں بہت سی خوشیاں لے کر آیا تھا، اسی کے ساتھ کچھ ایسے درد و غم بھی دے گیا جسے نا چاہتے ہوئے بھی ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ خاص کر ہم سب نے زبان و ادب سے متعلق کچھ ایسے گوہر نایاب اور دُر، یگانہ کھو دیئے جس کا قلق اس دل سے جاتے جاتے جائے گا۔ مجھے اس موقع پر مرزا غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

سال 2025 میں اردو اور ہندی کے علاوہ دیگر زبان سے تعلق رکھنے والے وہ افراد جو، اب اس دنیا میں نہیں رہے جن کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔ اردو ادب میں فکشن کے حوالے سے ہمیشہ یاد کی جانے والی شخصیت مستنصر حسین تارڑ، ممتاز شاعر ساقی فاروقی، بزرگ شاعر تابش مہدی، نوجوان شاعر ارشاد خان سکندر، ممتاز فکشن رائٹر سلیم اختر، بہترین کالمسٹ ڈاکٹر ایم بی قاسم، معروف صحافی ظفر اقبال، ونود کمار شکلا ہندی کے بہترین ناول نگار اور شاعر تھے 2024 میں انھیں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازہ گیا، پریتش نندی مشہور انگریزی شاعر صحافی اور کالم نگار، رام درش مشرا ہندی زبان و ادب کے معتبر ادیب و نقاد (انفارمیشن ڈپارٹمنٹ سے شائع ہونے والا ہندی ماہنامہ اتر پردیش، ان کی مجموعی خدمات پر ایک ضخیم نمبر شائع کر رہا ہے۔) یہ وہ دستاویزی شخصیات ہیں جن کا تذکرہ ادبی دنیا میں ایک زمانہ تک کیا جاتا رہے گا۔

ماہنامہ نیا دور کا یہ تازہ شمارہ اپنے تازہ مشمولات کے ساتھ اپنے قارئین کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس شمارے کی تدوین میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ زیادہ تر تخلیق کاروں کے اُن مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے، جو ایک موضوع سے متعلق ہیں لیکن الگ الگ زاویہ سے تحریر کئے گئے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کی گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کو پسند خاطر آئے گا۔ آخر میں مرزا غالب کے اس مکمل شعر سے حظ اُٹھائیں۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

آسیہ خاتون

یہ شمارہ جنوری ۲۰۲۵ء کا ہے جس کو فروری ۲۰۲۶ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر سائرہ خاتون
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مہیلا پی جی کالج، بہرائچ
8948264084

آگ کا دریا کا فنی و موضوعاتی مطالعہ

قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷-۲۰۰۷ء) اردو ادب کی وہ واحد خاتون فکشن نگار ہیں، جنھوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے مختلف اور جدید ترین راستوں کا انتخاب کیا۔ فکشن میں انھوں نے شعور کی رو، آزاد تلازمۂ خیال اور فلیش بیک جیسی مغربی تکنیکوں کا سہارا لیتے ہوئے اسے ایک کامل فنی کارنامہ کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی دونوں طرح کے ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں ایسی گہرائی و گیرائی، وسعت اور فنی پختگی در آئی ہے جو دوسرے ادیبوں کے یہاں مفقود ہے۔ انھوں نے انگریزی فکشن کے جدید ترین ہیئتی تجربات کو بھی اردو فکشن میں برتنے کی سعی کی۔ اس میدان میں انھوں نے جیمس جوائس اور ورجینا وولف جیسے ناول نگاروں کا تتبع کیا اور ان سے دو قدم آگے نکل گئیں کیونکہ جوائس اور وولف کے موضوعات اپنے ہی خطے، رہن سہن، طرز زندگی، اقدار و روایات تک محدود رہے جبکہ قرۃ العین حیدر نے قومی سطح سے نکل کر یورپ اور بین الاقوامی سطح پر درپیش ہونے والے مسائل و موضوعات کو خوبصورتی سے اپنے فکشن میں پیش کیا۔ ورجینیا وولف کے ناول Orlando سے متاثر ہو کر 'لکھا گیا ناول آگ کا دریا' قرۃ العین حیدر کا تیسرا ناول ہے۔ جس میں مصنفہ نے 'شعور کی رو' جیسی تکنیک کی مدد سے چھوٹے بڑے جملوں کو اشاروں اور کنایوں میں لپیٹ کر کرداروں کے مکالموں کے توسط سے مخصوص خیالات کو روانی بخش دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گوتم نیلمبر، ابوالمنصور کمال الدین، گوتم نیلمبر دت، نواب کمن ایک ہی فرد ہے جو شعور کی مختلف صورتوں میں اس وسیع تاریخی کینوس پر اپنے عہد کی تہذیبی اور ثقافتی آمیزشوں اور آویزشوں کے درمیان الجھتا اور سلجھتا ہوا وقت کے دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے اور ہر قرن میں مختلف روپ بدل کر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''اردو کے ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر نے تکنیک کے اس مغربی انداز کو اپنایا اور اس کے عناصر کو بڑی خوبی سے مشرقی روایت کے حسن میں سمویا ہے۔ ان کے ناولوں کا فن ناول نگاری کی اس جدید روش کا بڑا کامیاب نمونہ ہے جس میں واقعات اور اس کے ارتقاء سے زیادہ فرد کی زندگی اور اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کے بیان کو کہانی سمجھا جاتا ہے۔ اس فن میں پلاٹ کا وہ تصور باقی نہیں رکھا جس میں واقعات کی ایک کڑی دوسری کڑی سے مربوط اور وابستہ رہ کر ایک مکمل زنجیر کی تشکیل کرتی ہے۔''

(وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۳۰-۱۳۱)

زیر نظر ناول اردو ناول نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت کا متحمل ہے۔ ناول کا پلاٹ بہت وسعت کا حامل ہے، اس میں ڈھائی ہزار برس کی تاریخ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے قدیم تہذیب و ثقافت، فلسفہ، وقت کا تصور، مسئلۂ جبر و قدر، تقسیم ہند اور مہاجرت جیسے موضوعات کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی کہانی مہاراجہ چندر گپت موریہ کے عہد سے شروع ہو کر ملک کی تقسیم اور اس کی آزادی نیز اس کے زیر اثر فرقہ وارانہ فسادات اور خون آشام واقعات کے نتیجہ میں جلاوطنی، ہجرت، دربدری، دلوں اور گھروں کی ٹوٹ پھوٹ نیز گھروں کو دوبارہ تعمیر کرنے کی تمنا پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ ناول کی اہمیت بیان کرتے ہوئے وحید اختر لکھتے ہیں:

> ''ناول کے ابتدائی حصے میں قدیم ہندوستان کے فکری دبستانوں کی تاریخ اور دوسرے معاشرتی اثرات بھی دکھائے گئے ہیں۔ اسی حصے میں ہندوستان کے اولین راجا بمبسار سے لے کر 1956 تک کی ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی ابتدا ویدک عہد سے ہوتی ہے، جو مغلیہ خاندان کے عہد حکومت، مغلیہ سلطنت، انگریزی مداخلت اور پھر ملک کا بٹوارہ اور اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے سنگین مسائل کو پیش کرتا ہوا اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ ناول میں قدیم تاریخی شہروں مثلاً شراوستی، ہستنا پور، لکھنوتی، ایودھیا، تکشلا، کاشی، پاٹلی پتر اوغیرہ کے تہذیبی و ثقافتی اقدار کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ناول کے بیانیہ کو پُرزور بنانے کے لیے 'وقت' کا سہارا لیا گیا ہے۔ مصنفہ کے نزدیک 'وقت' ایک اکائی ہے، جسے ماضی، حال اور مستقبل میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ یہ ہمیشہ موجود اور رواں دواں رہتا ہے۔''

”آگ کا دریا پہلا اردو ناول ہے جو موجودہ عہد کے انسان اور اس کے مسائل وجود پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔.....اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے ہزاروں برس کے وسیع پس منظر کو ناول کے کینوس پر پھیلا دیا ہے۔اس طرح ہندوستان کی کئی ہزار سالہ تاریخ، کلچر، فلسفے اور رسم و رواج اس دریا کی موجوں میں سمٹ آئے ہیں۔

(وحید اختر، آگ کا دریا: وجودیت کے اثرات، مشمولہ قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ، پروفیسر ارتضیٰ کریم ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۶ء، ص: ۴۲)

کئی سو صفحات اور 101 ابواب پر مشتمل ”آگ کا دریا“ پلاٹ کی وسعت کے سبب مختلف النوع موضوعات کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔اس میں قرۃ العین حیدر نے چوتھی صدی قبل مسیح، پندرھویں صدی کا نصف اول اور سولہویں صدی کا نصف آخر پھر اٹھارویں صدی کا ربع آخر، اس کے بعد انیسویں صدی کا بیشتر حصہ اور پھر عہد جدید یعنی تقریباً ڈھائی ہزار برسوں کو محیط انتہائی پیچیدہ ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار کو ناول میں پیش کر دیا ہے۔ان ڈھائی ہزار برسوں میں ہڑپا تہذیب جس کا زمانہ ۲۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۷۵۰ قبل مسیح کی تاریخ بھی ہے اور آریوں کی ۱۵۰۰ قبل مسیح ہندوستان آمد اور ان کے پدوں کے قیام یعنی ۶۰۰ قبل مسیح تک کا ذکر بھی شامل ہے۔اس میں تصور وقت، تاریخ اور تہذیب، قدیم ہندو فلسفہ اور مذہب، ہندو مسلم مشترکہ تہذیب اور وجودیت جیسے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ناول کو درج ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) پہلا دور ویدک کال سے شروع ہو کر موریہ خاندان کی حکومت پر اختتام پذیر ہوتا ہے جو تاریخی اعتبار سے ہندو دھرم اور بدھ مت کا عہد زریں ہے۔گوتم نیلمبر اسی پہلے دور یعنی قدیم ہندوستان کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے۔

(۲) دوسرا دور وسطی اور اسلامی مسلمانوں کے ورود سے شروع ہوتا ہے اور مغلیہ حکومت کے زوال پر ختم ہو جاتا ہے۔ابوالمنصور کمال الدین اس پورے اسلامی عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔

(۳) تیسرا اور آخری دور جدید لکھنؤ سے شروع ہو کر تقسیم ہند کے المناک حادثے پر ختم ہوتا ہے۔

(۴) آخری دور میں تقسیم ملک کے بعد کی المناکیوں کو پیش کیا گیا ہے، جس میں خونیں جنگ، لوٹ، قتل و غارت گری، عصمت دری، ہجرت، مہاجرین کا کرب، اپنوں سے بچھڑنے کی کلفت اور نئے ملک میں باز آبادکاری پھر بے روزگاری اور کاروبار کی تلاش جیسے مسائل کا ذکر ہے۔اس طرح ناول کو چار ادوار میں تقسیم کر کے ہندوستانی تاریخ کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول کا پہلا حصہ بیانیاتی انداز کا ہے، جو قدیم ہند آریائی بدھ اور جین تہذیب و ثقافت پر مشتمل ہے۔اس میں مصنفہ نے ہندوستان کی تاریخ اور فلسفۂ کائنات بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کے عہد کا تذکرہ کیا ہے۔یہ دور ہندوستان کے عظیم الشان مشترکہ کلچر کا عہد ہے۔مصنفہ نے اس وقت کے پانچ طبقاتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں چھتری، برہمن، ویش، شودر اور چنڈال وغیرہ شامل ہیں۔اسی دور میں قدیم تہذیب کے آئینہ میں مہابیر اور گوتم جیسی عظیم شخصیات اور ویدو گیتا کے حکیمانہ اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ساتھ ہی بھگوان رام اور کرشن، منوہر مہراج، چانکیہ کالی داس، بھبھوتی، بھرتری ہری کا بھی ذکر ہے۔اجودھیا، کپل وستو، کاشی، پریاگ جیسے مقدس شہروں کا بھی بیان ہے جہاں قدیم ایام میں علم کے دریا بہہ رہے تھے۔اسی حصے میں ہندوستان کی قدیم تاریخی فضا، اس فضا کی معاشرت، رہن سہن اور طرز فکر کا بھی بیان ہے۔اس عہد کو گوتم بدھ کا دور کہا جاسکتا ہے، جس عہد کے گوتم بدھ فلسفی ہیں اور اپنے عہد کا نمایاں طالب علم ہیں۔وہ مروجہ علوم میں درک رکھتا ہیں۔

ناول کا دوسرا دور ہند- اسلامی تہذیب سے ہم آہنگ ہے جس میں مسلمانوں کا ہندوستان میں ورود ہوتا ہے اور کمال ابوالمنصور جیسے نمائندہ کردار کی شکل میں ابھرتا ہے۔وہ مسلمانوں کی اس عظیم تہذیب اور حکومت کی نمائندگی کرتا ہے جو مسلمانوں کی آمد کے بعد دلی اور دیگر مقامات پر قائم ہوئی تھی۔کمال الدین دوسرے ملک سے وارد ہونے والا مسلمان ہے جو رفتہ رفتہ ہندوستانی فضا اور تہذیب میں گھل مل جاتا ہے اور پھر ہندوستان کو ہی اپنا وطن تسلیم کرنے لگتا ہے۔اس حصہ میں مسلمانوں کی آمد کے بعد کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔اس دور کی نمائندگی کرنے والا مشہور کردار ابوالمنصور کمال الدین ہے۔

ناول کے تیسرے دور میں مسلمانوں کے زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں استحکام کا بیان ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح رفتہ رفتہ پورے ہندوستان کی زمام انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔اس حصے میں انگریزوں کی پالیسیوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں اپنی بساط جمانے کے لیے کس کس طرح کے ہتھکنڈے اپنائے۔۔اس دور کی نمائندگی کرنے کے لیے گوتم نیلمبر نامی شخص ایک کلرک کی شکل اور ابوالمنصور کمال الدین ایک بنگالی کاشتکار کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔اس دور کا نمائندہ کردار سرل ہارورڈ ایشلے بھی ہے جو ایک پادری کا بیٹا ہے۔

ناول کا چوتھا دور تقسیم ہند سے قبل اور اس کے بعد کے منفی رویوں پر مشتمل ہے۔اس عہد میں ناول کی کہانی ہندوستان سے یورپ منتقل ہو جاتی ہے اور تیسرے دور کے آخر میں متوسط طبقہ کی نمائندگی کرنے والے لندن کیمبرج اور پیرس میں موجود نظر آتی ہے۔اس دور میں گوتم، کمال، ہری شنکر، چمپا کے علاوہ دوسرے کردار طلعت اپی، بھیا صاحب، نرملا وغیرہ نمائندگی کرتے ہیں۔یہ تمام کردار خواندہ، ذہین، حساس، باشعور اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے ہیں۔یہ کردار اصولی دنیا کے بادشاہ ہیں مگر عملی اقدام سے قاصر ہیں۔ان کے خواب اور آرزوئیں صرف تصورات ہی تک محدود ہیں۔اس دور میں کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش بھی دکھائی گئی ہے۔ناول کا پانچواں دور ہندوستانی اور پاکستانی معاشرت اور اس کی کشاکش سے متعلق ہے۔

ناول کے ابتدائی حصے میں قدیم ہندوستان کے فکری دبستانوں کی تاریخ اور دوسرے معاشرتی اثرات بھی دکھائے گئے ہیں۔اسی حصے میں ہندوستان کے اولین راجا بمبسار سے لے کر 1956 تک کی ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ناول کی ابتدا ویدک عہد سے ہوتی ہے، جو مغلیہ خاندان کے عہد حکومت، مغلیہ سلطنت، انگریزی مداخلت اور پھر ملک کا بٹوارہ اور اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے سنگین مسائل کو پیش کرتا ہوا اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ناول میں قدیم تاریخی شروں مثلاً شراوستی، ہستنا پور، لکھنوتی، ایودھیا، کاشی، پاٹلی پترا وغیرہ کے تہذیبی و ثقافتی اقدار کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ناول کے بیانیہ کو پُرزور بنانے کے لیے ’وقت‘ کا سہارا لیا گیا ہے۔مصنفہ کے نزدیک ’وقت‘ ایک اکائی ہے، جسے ماضی، حال اور مستقبل میں نہیں بانٹا جاسکتا۔یہ ہمیشہ موجود اور

رواں دواں رہتا ہے۔ وقت کی گرفت پوری تاریخ اور انسان پر اس قدر شدید ہے کہ اس کے سامنے سب کچھ فنا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وقت کی ہلاکت خیزی کے حوالے سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''یہاں سے اپنے پیاروں کی ارتھیاں نکلیں، دلہنوں کے ڈولے آئے، براتیں چڑھیں بیٹیاں وداع ہوئیں، بڑے بڑے تہوار منائے گئے، رام نومی اور جنم اشٹمی اور دیوالی اور شیوراتری۔ یہاں بچے پیدا ہوئے، لڑائیاں جھگڑے ہوئے، لوگ ہنسے اور روئے۔ ہر گھر میں یہ سب ہوتا ہے۔ گھر خاموشی سے یہ سب دیکھتا رہتا ہے۔ س کی داستان پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ اس کی وقت سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔ دیکھتا ہوں تم میرا ساتھ کب تک دیتے ہو۔ تم میری نشان دہی کب تک کرتے رہوگے۔ وقت کہتا ہے پھر پر بھی خاموش رہتا ہے۔ برس گزرتے ہیں، صدیاں بدلتی ہیں، موسم پلٹ پلٹ کر آتے ہیں، گھر وقت کی ندی میں چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے، کبھی کبھی لہریں اسے بہالے جاتی ہیں، پھر اس کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔''

(آگ کا دریا قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، پہلا ہندوستانی قانونی ایڈیشن ۱۹۸۹ء ص:۲۳۳)

'وقت' کی رفتار کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات میں بھی تبدیلی آتی جاتی ہیں 'وقت' کا شعور قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں کبھی واضح اور کبھی مبہم صورت میں پایا جاتا ہے۔ ان کے فکری نظام میں دو چیزوں کو بطور خاص اہمیت حاصل رہی ہے: ایک فنا اور دوسرا تاریخیت کا شعور۔ یہ دونوں چیزیں ان کی تحریروں کا حسن ہیں لیکن تاریخیت کا شعور ''آگ کا دریا'' میں زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ خصوصاً جدید دور کی تاریخی جھلکیاں، تاریخ کی تباہیاں، تقسیم، فسادات اور جنگیں، انسانی حقوق کی پامالی، جبر و قدر کا مسئلہ، تہذیبوں کی کشمکش، نسلی تعصبات، غریب الوطنی اور مختلف فلسفوں کے انسانی افکار و اعمال پر اثرات اس ناول کا حصہ ہیں۔

''آگ کا دریا'' کا بنیادی موضوع تاریخ اور تہذیب ہے لیکن ان دونوں میں موجزن وقت کا بہاؤ اور اس کے اثرات بھی ناول میں نظر آتے ہیں۔ ناول کے کردار گوتم نیلمبر، ابو المنصور کمال الدین، ہری شنکر، چمپا، سرل ایشلے گویا 'وقت' کے پڑاؤ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے سفر کا اختتام دوسرے کے سفر کا آغاز بن جاتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر کردار (تعلق دار، جاگیر دار اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ) اس عہد کی معاشرتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ ناول بیک وقت تاریخی بھی ہے، علامتی بھی اور جمہوری بھی۔ بودھ ازم، صوفی ازم، مارکس ازم کے ذریعے ہندوستانی تہذیب اور اس کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

زیر نظر ناول کی اہمیت کی اصل وجہ اس کا موضوعاتی تنوع ہے جو سیاسی، سماجی، نفسیاتی، تہذیبی اور تاریخی شعور پر پھیلا ہوا ہے کیوں کہ جب کسی معاشرے کا مخصوص طرزِ عمل تاریخ کے تانے بانے سے گزرتا ہے تو اس میں نئی قوموں اور نئی تہذیبوں کی شمولیت سے تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے، جو قرۃ العین کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ناول میں کئی ادوار اور قرنوں کی فضا پیش کی گئی ہے، جس میں ہندستان کے مختلف حصوں کے ساتھ ساتھ مختلف اقوام و قبائل کی تاریخی و تہذیبی سرگرمیاں بھی ہیں۔ ناول کے پلاٹ کی وسعت کا اندازہ اس کے متنوع موضوعات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے 'وقت' ناول کا سب سے اہم موضوع ہے۔ وقت کی گرفت پورے ناول کی کہانی اور اس کے پلاٹ پر اس قدر شدید ہے کہ اس کے سامنے سب کچھ فنا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وقت ہی تو ہے جس کو محور بنا کر قرۃ العین حیدر نے ہندستان کی ڈھائی ہزار سالہ قدیم تاریخ کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے ماضی اور حال کی مراجعت سے ناول اس لائق بنا دیا ہے کہ قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ 'وقت' کے پس منظر میں تہذیبوں کے عروج و زوال کی داستانیں اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے مشاہدات و تجربات کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں 'تہذیب' بھی موضوع کی حیثیت سے برتا گیا ہے۔ مصنفہ نے عالمگیریت کے حوالے سے کافی مواد فراہم کیا ہے۔ عالمگیرت کا مطالعہ معاشی استحصال اور تہذیبی تبدیلی کے موضوعات سے منسلک ہے۔ ناول میں وقت کا جبر اور تہذیبوں کی کشمکش ہر مقام پر پائی جاتی ہے۔ وقت کے حوالے سے وہ لکھتی ہیں:

''.....ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔..... وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔.....انسان بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے اور جوانی اور بڑھاپے میں کچھ اور۔ تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔.....وقت جو سیال تھا۔ وقت جو برف میں منجمد تھا.....ہم وقت سے اور اندھیرے سے خوفزدہ ہیں کیونکہ وقت ایک روز ہمیں مار ڈالے اور اندھیرا ہماری آخری جائے پناہ ہوگا۔ وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔''

(آگ کا دریا ص:۲۵۷-۲۵۸-۵۳۶)

زیر نظر ناول میں وقت اور تہذیب کے ساتھ ساتھ بے شمار فلسفیانہ باتیں بھی پیش کی گئی ہیں جن کی ادائیگی کے لیے مصنفہ نے منتخب اور مقدس شخصیات کا انتخاب کیا ہے۔ ناول میں سرجوندی اور شراوستی کو بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ یہ ہندستانی تاریخ کے تہذیبی دھارے ہیں۔ ہندوستان کی صدیوں قدیم تہذیبی تاریخ میں سرجوندی اور شراوستی تہذیبی اور تمدنی علامات تصور کی جاتی تھیں۔ اسی طرح ناول میں قرۃ العین حیدر نے انسان کی ارتقائی منازل کے بعض روشن پہلوؤں کو پیش کر کے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ اس مدت میں انسان نے خدا اور کائنات کے متعلق جس طریقے سے سوچ بچار کیا، اس نے جس ہم آہنگی کی تلاش کی، اس کی تہذیبوں اور سلطنتوں نے جس طرح فتوحات حاصل کیں، انسانی رشتوں میں محبت اور نفرت، ایثار اور خود پسندی، عقل اور عشق کی آویزش نے جو پیچیدگیاں پیدا کیں، اور ان تغیرات سے انسان کی شخصیت کی نشو نما پر جو اثرات مرتب ہوئے، مجرد فلسفہ اور مجرد تاریخ سے کہیں زیادہ یہی سارے عوامل اس ناول کے موضوعات ہیں۔ ناول کے کرداروں کے انتخاب میں بھی بڑے فلسفیانہ شعور کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ گوتم نیلمبر کے کردار کو ہر عہد میں پیش کر کے مصنفہ نے فلسفۂ تناسخ (آواگون) کے نظریہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ گوتم ہر عہد میں اپنا علاقہ اور اپنا سیاق و سباق بدل کر بار بار جنم لیتا ہے اور ناول کے ہر عہد میں نظر آتا ہے۔ چمپا کے کردار کو ہندو، مسلمان، اعلیٰ، اشراف کے علاوہ طوائف اور بھکارن کی شکل میں پیش کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ مرد اساس معاشرے میں عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ عورت کے اندر حالات کے مطابق ڈھل جانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ناول

میں فلسفیانہ خیالات کو مصنفہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

''ابدیت پرست کہتے تھے کہ روح اور دنیا دونوں ابدی ہیں۔ محض زندگیوں کا تسلسل قائم ہے اور ابدالآباد تک رہے گا۔ چند کے نزدیک آتما اور دنیا ایک حد تک ابدی تھیں اور ایک حد تک نہیں۔ انانتکوں کے نزدیک دنیا یا محدود تھی یا غیر محدود۔ اس کے ساتھ ہی دنیا محدود تھی نہ غیر محدود۔ سیادوادیوں کا خیال تھا کہ ہر چیز ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ خود کسی بارے میں قطعی رائے نہیں دیتے تھے۔ دوسری دنیا ہے یا نہیں۔ حادثہ ہے یا نہیں۔ جزا وسزا ہے یا نہیں۔ حیات بعد الممات ہے یا نہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا اور آتما محض حادثے کے طور پر ظہور میں آئے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ انھیں خود یاد تھا کہ کچھ عرصے قبل وہ نہیں تھے اور اب ہیں۔ صدیاں گزرتی گئیں۔ ذہن اپنشدوں کی شدید مابعد الطبیعات سے اکتا گیا۔ رفتہ رفتہ خدا جو فلسفے کا ایک مسئلہ تھا شخصی بنا۔ مابعد الطبیعات کے کارن نے اوتار کا روپ دھارا۔ اضافی کا مطلق سے تعلق خرد کے بجائے وجدان ٹھہرا۔

(آگ کا دریا، ص:۶۶)

''آگ کا دریا'' کا موضوع دراصل وجودیت، عدمیت، حسیت، گمشدوں کی جستجو، انسانی صورتحال کی بنتی بگڑتی صورتیں اور ان کی ازلی وابدی جستجو ہے۔ کیونکہ ناول میں انسان کی اس سرگزشت کا بیان ملتا ہے، جسے قرنہا قرن سے نئے نئے حالات وماحول اور تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس میں اس آدم کی آپ بیتی بھی ہے، جسے لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر ہوتی ہوئی کائنات میں اپنے وجود کا کرب اور عذاب برداشت کرنا پڑا۔ اسی انسان نے انسانیت کی آبیاری کی، اس نے تہذیب وثقافت کی پرورش کی اور فلسفوں کو جنم دیا۔ اسی نے اس عظیم کرۂ ارض پر اپنی ایک عظیم تاریخ رقم کی۔

قرۃ العین حیدر کو تاریخ پر دستگاہِ کامل حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے اکثر ناولوں میں تاریخ جیسے گنجلک موضوع کو برتنے کی کوشش کی ہے، یہی کوشش آگ کا دریا میں بھی نظر آتی ہے۔ مصنفہ کو اپنی ہزاروں سالہ قدیم تاریخ سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور ان کا حساس دل واقعات وسانحات سے بھی متاثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے سانحے سے دلبرداشتہ ہو کر اس کی وجہ تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئیں اور ہندوستان کی جدید تہذیب و ثقافت کے سرے عہد قدیم کی تاریخ سے منسلک کرکے یہ بتانے کی کوشش کی کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے آغاز وارتقاء اور ہند-اسلامی تہذیب کیسے وجود میں آئی۔ اس مخلوط تہذیب میں رخنے کب اور کیسے پیدا ہوئے؟ اور جدید نسل ان فاصلوں کو بڑھنے سے کیوں نہیں روک سکی؟ اس طریقے کے اسباب وعلل کا جس طرح اس ناول میں پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب پر بھی مصنفہ کو درک حاصل ہے۔ زیر نظر ناول میں مصنفہ نے لکھنؤ کی تہذیب وتمدن، وہاں کی عمارات، درسگاہوں اور رسوم رواج کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے جس عہد کے لکھنؤ کو اپنے ناول میں پیش کیا وہ 41-1940 کا عہد ہے۔ اس عہد کی تصویر کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے حد درجہ تفصیل اور جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اس عہد کے لکھنؤ کے اتحاد، اخوت اور مثالی معاشرہ کی جھلک پیش کی ہے کہ کس طرح دو خاندان ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رہتے تھے۔ چمپا کے ایک ماموں جو لکھنؤ میں مقیم تھے انہیں بہت خوشحال پیش کیا ہے۔ ناول کے اسی دور میں مصنفہ نے مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت، علی برادران اور ڈاکٹر انصاری کی جدوجہد آزادی کا ذکر کیا ہے۔

ناول میں طبقاتی کشمکش کی پیچیدگیوں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ ناول کے ابتدائی حصہ میں ہندوستان کا جو عہد پیش کیا گیا ہے، اس میں آریوں کی آمد کے بعد کا معاشرہ مختلف ذاتوں میں منقسم تھا۔ اس عہد میں چھتری سب سے اعلیٰ طبقہ تھا جو جنگی سرگرمیاں انجام دینے پر مامور تھا۔ دوسرے نمبر پر برہمن تھے جو مذہبی امور انجام دیتے تھے۔ تیسرے درجے پر ویش تھے جو تجارت کا کام کرتے تھے، جبکہ شودر جنھیں غلام بنالیا گیا تھا، یہ ہندوستان کے اصل باشندے تھے۔ سب سے نچلے طبقے سے چنڈال کا تعلق تھا جن کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ اسی طرح ناول کے مختلف ادوار میں طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے۔ پہلے حصہ میں دو ہی طبقات آقا اور غلام تھے لیکن بعد کے دور میں طبقاتی نوعیت کی تبدیلیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں اعلیٰ طبقہ، متوسط طبقہ، نچلا طبقہ، متوسط طبقہ اور پھر اعلیٰ طبقہ کے ذریعہ مصنفہ نے طبقاتی نظام کی کشمکش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرۃ العین حیدر اپنے کرداروں کے انتخاب میں بہت دروں بینی اور دوراندیشی سے کام لیتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں مشاہدے کی گہرائی وگیرائی اور تجرباتی وسعت کا اثر تمام کرداروں میں پایا جاتا ہے۔ یہی رویہ انھوں نے زیر نظر ناول میں بھی اپنایا ہے۔ انھوں نے کردارنگاری کے ہر پہلو پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ چونکہ ''آگ کا دریا'' ناول میں بہت سارے کردار ہیں، جو مختلف عہد میں ناموں میں تبدیلی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو گوتم نیلمبر عہد قدیم میں ہے اسی کا دوسرا جنم عہد وسطیٰ میں یا عہد جدید میں ہوتا ہے، حالانکہ یہ الگ الگ کردار ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے کردار بے جان نہیں ہیں، ان کے کردار انٹلکچوئل سطح سے شروع ہو کر تخلیقی فن کے دائرے میں نشوونما پاتے ہیں۔ ان کے کردار ہماری جدید شہری زندگی اور جدید معاشرت کی ایک خاص ذہنی سطح کو پیش کرتے ہیں۔ اگر ناول کے کرداروں کی زمرہ بندی کی جائے تو درج ذیل صورت بنتی ہے:

عہد قدیم کے کرداروں میں گوتم نیلمبر، چمپک، ہری شنکر عہد متوسط کے کرداروں میں ابوالمنصور کمال الدین احمد، چمپاوتی اور عہد جدید کے کرداروں میں سرہارڈ ایشلے، نواب کمال الدین احمد عرف کمن، گوتم نیلمبر دت، ہری شنکر شری واستو، چمپا بائی، کمال، گوتم نیلمبر اور چمپا احمد وغیرہ نمایاں کردار ہیں۔ گوتم نیلمبر مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے، جو ہندوستان کی تہذیب اور تاریخ کا نمائندہ ہے۔ گوتم ابدی انسان کی علامت ہے، اس کی گرفت انسانی بقا کی جدوجہد کی نشانی ہے۔ چمپا خالص ہندوستانی تہذیب وثقافت کی شدید کشمکش کا نتیجہ ہے۔ وہ شوخ، بے باک اور زندگی کی قوتوں سے مملو ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے ضمنی کردار ہیں، جو ناول کی فضا کے عین مطابق اور ناول کو آگے بڑھانے میں معاون ومددگار ہیں۔ ان میں بعض کردار ایسے ہیں جو دراصل ایک ہی فرد ہیں لیکن اپنی ذہنیت اور روپ بدل کر ہر قرن میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اپنے مختلف خیالات اور رویوں سے ایک نیا پیغام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیر نظر ناول کے کرداروں کے نام علامتی

اور اشاراتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں کردارنگاری کا قدیم تصور مفقود ہے، بلکہ ان کے کردار جدید اور حقیقت نگاری کے تصورات کے تحت عمل انجام دیتے ہیں۔ ان کے کرداروں کے اندر بالعموم زندگی کی ہمہ جہتی ملتی ہے۔ یہ کردار علامتی ہونے کے ساتھ حقیقی زندگی سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

منظرنگاری کے حوالے سے اس ناول نے عمدہ مثال قائم کی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے بیشتر ناول فطرت کی شاعرانہ عکاسی سے شروع کیے ہیں۔ ان کے ناولوں میں فطرت ایک خاموش کردار ادا کرتی ہے۔ ان کی منظرنگاری کسی نہ کسی تاریخی مقصدیت اور صداقت کو اپنے اندر موجزن رکھتی ہے۔ منظرنگاری کے بیان میں انھوں نے اکثر رومانیت سے کام لیا ہے۔ ان کی منظرنگاری تاریخی مقصدیت اور صداقت پر مبنی ہے۔ مصنفہ کو رنگین نثر سے بھی بیحد دلچسپی ہے۔ ان کے اسلوب میں بانکپن اور شوخی پائی جاتی ہے، کہیں وہ شاعرانہ زبان استعمال کرتی ہیں اور کہیں زیادہ سہل اور سلیس زبان استعمال کرتی ہیں مشاہدات کی باریک بینی ان کے مناظر کو جاذب نظر بناتی ہے۔ ان کی تحریروں میں فضا آفرینی یا منظرنگاری کی بہتات ہے۔ وہ جہاں جہاں اپنے کرداروں کی سوچ کی لہریں ملاتی ہیں وہیں مناظر کے پیش کش اس انداز سے کرتی ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا منظر سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ اس حوالے سے یہ اقتباس دیکھیے:

> ''ندی کے وسط میں پہنچا تو بارش کی دوسری بوند گوتم کے سر پر آن گری۔ برسات کی وجہ سے سرجو کا پاٹ بے حد چوڑا ہوگیا تھا۔ سون ندی کے پاٹ سے بھی زیادہ چوڑا جسے پاٹلی پتر جاتے ہوئے گوتم نے ایک مرتبہ پیر کر عبور کیا تھا۔ اس نے پیرتے پیرتے پلٹ کر ایک بار دیکھا۔ گھاٹ پر لڑکیاں اب تک بیٹھی تھیں اور وہ بھی موجود تھی جس کے بالوں میں چمپا کا پھول تھا۔ ان لوگوں کو مینہ میں بھیگنے کا بھی ڈر نہیں۔ گوتم نے دل میں کہا اور پھر جلدی جلدی لہروں کا مقابلہ کرنے میں منہمک ہوگیا۔ سامنے دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر چھک آئی تھیں۔ برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے۔ ساس اور مور سمٹے سمٹائے اداس کھڑے تھے۔ چار پانچ آمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھا رہے تھے۔''

(ص:۱۴)

یا یہ اقتباس:

> ''بارش جھما جھم برسنا شروع ہوگئی تھی۔ مینڈک ٹرا رہے تھے۔ مور جھنکارتے تھے۔ پپیہا غل مچا رہا تھا۔ ساون کی گھٹائیں جھوم کر اٹھی تھیں۔ رگ وید میں صدیوں پہلے برکارت کی جیسی منظرکشی کی گئی تھی وہ منظر مکمل طور پر ویسا اس سمے سامنے موجود تھا۔ کٹی کے پھونس پر لوکی کی بیل پھیلی تھی۔ اس پر سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر گوتم کے پیروں کو بھگوئے ڈال رہے تھے۔ وہ کٹی کے برآمدے میں بیٹھا ساون کی آوازیں سنتا رہا۔ سازوں کا ایک بہت عظیم اجتماع تھا جس پر سرسوتی میگھ راگ بجا رہی تھی۔ امن اور سکون کا راگ۔''

(ص:۳۱)

ناول میں بیانیہ کے ساتھ ساتھ جو مکالمے پیش کیے گئے ہیں وہ انتہائی فطری اور کرداروں کے عین مطابق ہیں۔ ناول کے زیادہ تر مکالمے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دانشور طبقات سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے ذریعہ ادا کرائے گئے ہیں۔ ان مکالموں سے کرداروں کی شخصیت، مزاج اور ان کے فطری میلان کی عکاسی ہوتی ہے۔ اکثر مکالمے دانشورانہ بحثوں اور تاریخ وتہذیب، فلسفہ، وجودیت اور مشترکہ کلچر کے پس منظر میں اجاگر کیے گئے ہیں۔ بعض کرداروں کے ذریعہ خودکلامی کے انداز میں بھی مکالمے دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن کہیں کہیں تخیلی مکالمے کے سبب ناول کمزور نظر آتا ہے اور کچھ جگہوں پر یہ تخیلی مکالمے کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

> ''تم کون ہو بھائی؟'' نیچے سے کسی نے پوچھا۔
>
> ''میں ہوں۔'' گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔
>
> ''تمہارا نام کیا ہے؟''
>
> ''میں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔''
>
> ''تفریق کے لیے نام ضروری ہے۔''
>
> شراوستی کے پنڈتوں کے گھرانے میں پیدا ہوا وہاں دوسرے پنڈتوں سے پوچھ کر میرا نام گوتم رکھا گیا تھا۔''
>
> ''بھائی گوتم نیچے آجاؤ۔''
>
> ''تم خود اوپر کیوں نہیں آتے۔''
>
> ''اونچائی اور نیچائی محض ذہنوں کے فرق سے ہوتی ہے۔''
>
> ''ہوں۔''
>
> ''تم کو کیا معلوم جسے تم اونچائی سمجھ رہے ہو وہ پاتال سے بھی گہری ہو۔''
>
> ''بھائی'' گوتم نے اسی طرح دیوار سے نیچے جھانکے بغیر سوال کیا:
>
> ''کیا تم بھگوت ہو؟''
>
> ''نہیں — مگر تم مندر سے نیچے نہیں اتروگے؟'' (آگ کا دریا، ص:۱۷-۱۸)

زبان و بیان کے حوالے سے بھی 'آگ کا دریا' کا کوئی ثانی نہیں۔ اس میں زبان و بیان کی موزونیت اور بلیغ رمزیت، سادہ سلیس، شستہ اور رواں اسلوب سے مزین سیکڑوں مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے اسلوب کا اختصاص یہ ہے کہ وہ جس ماحول و معاشرہ کا نقشہ کھینچتی ہیں، اسی ماحول کے مطابق زبان بھی استعمال کرتی ہیں۔ آگ کا دریا بھی کثیر لسانی ناول ہے، جس میں عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور اودھی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے قرۃ العین حیدر کی زبان شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بیک سمے کئی زبانوں اور اسلوب و ہیئت پر درک رکھتی تھیں۔ انھوں نے اردو کے ساتھ انگریزی ادب بھی پڑھا تھا اور براہ راست انگریزی ادب سے مستفیض ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہیئتی تجربات سے بھی پوری طرح استفادہ کیا۔ شعور کی رو، نفسیات اور تاریخیت کے سیاق میں انھوں نے مغرب و مشرق کو ذہن میں رکھ کر ناول تخلیق کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ''آگ کا دریا'' موضوعی، فنی، تکنیکی، اسلوبیاتی اور ہیئتی اعتبار سے ناول نگاری کے میدان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

❑❑❑

ڈاکٹر نادرہ پروین

سیتا پور روڈ دبگا لکھنؤ

6393219772

''لہو کے پھول'' مسائل اور کرب

''انگریزوں سے برسوں کی آزادی کچھ دنوں کے لیے لوگوں کے دلوں کو مسحور اور فرحت بخشتی رہی اور ہر طرف خوشی کے شادیانے بجتے رہے، مبارکباد پہ مبارکباد پیش ہوتی رہی، مگر اس کی آڑ میں جو فساد برپا ہوئے اور دو قومی نظریے کا طوفان کھڑا ہوا وہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمان ہندو کی جان کا پیاسا اور ہندو مسلمان کی جان کے درپے، ایک دوسرے کی عزتیں لوٹی جانے لگیں۔ وہ جو بھائی چارے کا ماحول تھا ایک ہندو مسلمان کی تھالی میں اور مسلمان ہندو کی تھالی میں کھاتا، ہر ایک کا کاروبار دوسروں سے چلتا تھا، سب کچھ برباد ہوگیا اور نفرت کی آگ میں جل کر خاکستر ہوگیا۔ لوگ ایک دوسرے سے ملنا تو دور ذکر کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ چند دنوں کے بعد ماحول اس قدر خراب ہوا کہ مسلم مسلم لیگی اور ہندو کانگریسی کہے جانے لگے اور یہ بات عام ہونے لگی کہ مہاسبھا اور کانگریس ہندوؤں کی پارٹی ہے جسے مسلمانوں سے سخت نفرت ہے۔''

۱۹۴۷ء کا واقعہ ایک ایسا المیہ تھا جس نے پوری انسانیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہندوستان جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اسے مدتوں بعد آزادی تو نصیب ہوئی مگر اس کی تقسیم نے پوری ہندوستانی فضا کو غم آلود کر دیا۔ غم و غصہ کا عالم یہ تھا کہ وہ لوگ جو ایک ساتھ زندگی گزار رہے تھے ان کے درمیان بھی ایسی پھوٹ پڑی کہ لوگ نیک و بد کی تمیز بھلا بیٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کی صبح اپنے ساتھ خون خرابہ، جنگ، فرقہ وارانہ فساد، مذہبی منافرت اور انسانیت کشی جیسے مسائل ساتھ لے کر آئی۔ وطن کے منقسم ہونے کا مسئلہ بذات خود ایک دردناک سانحہ تھا۔ ساتھ ہی اس کا شدید ردعمل فسادات کے طور پر سامنے آیا اور خونریزی کی وہ داستان لکھی گئی جس سے آج بھی تاریخ کے اوراق چھلنی ہیں۔ نفرت کا بازار اس قدر گرم ہوا کہ ایک قوم دوسری قوم کی پیاسی نظر آنے لگی۔ ایک طرف تو وہ مسلمان قوم جس نے مدتوں اس سرزمین پر زندگی گزاری ہر اچھے برے دن دیکھے یہاں کی مٹی میں پلے بڑھے اب وہ مسلمان اپنا سب کچھ قربان کر کے پاکستان ہجرت کر رہے تھے۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس نے نہ صرف انسانی زندگی کو متاثر کیا بلکہ اس کے گہرے اثرات ادب پر بھی رونما ہوئے۔ ادب کی کوئی بھی صنف چاہے وہ نظم ہو یا غزل، افسانہ ہو یا ناول، نثر ہو ادب کی کوئی اصناف، ہجرت، فساداتِ تقسیم جیسے موضوعات کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا۔ ادبا نہ صرف اس اندوہناک اور خونی داستان کو اپنے قلم کے ذریعے اجاگر کر رہے تھے بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعہ ذہن پروری کا کام بھی کر رہے تھے۔ اس المیے نے صرف ملک کو تقسیم نہیں کیا بلکہ رشتوں میں دراڑ پیدا کر دی ایک ہی گھر میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے والے ایک ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانے والے الگ الگ ملکوں کا حصہ بن گئے۔ تقسیم ملک نے ایک عجیب حالات پیدا کر دی تھی ایک تو زندہ لوگوں سے زندگی بھر کے لیے بچھڑنے اور چھوٹ جانے کا رنج اور دوسری جانب ہر جگہ چاہے وہ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے ہوں یا پاکستان سے ہندوستان آنے والے لوگ ہوں، ان سب کے سامنے معاشی اور اقتصادی مسائل اپنا منھ کھولے کھڑی تھی۔ اس تقسیم نے جہاں یہ سب مسائل پیدا کیے وہیں ہزاروں بے گناہ انسانوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ آزادی کے نام پر ملنے والی تقسیم نے انسانی زندگی اور انسانیت دونوں کو تہس نہس کر دیا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے جن جن علاقوں میں شدت اختیار کیا وہاں قتل و غارت کا ایسا بازار گرم ہوا کہ درندگی کی تمام حدیں پار ہوگئیں۔ بقول فرمان فتح پوری:

> ''آزادی کا دیا پوری طرح روشن نہ ہونے پایا تھا کہ فسادات کے نام سے برق و باد نے گھیر لیا۔ گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر قتل و غارت کی آندھیوں میں تنکے کی طرح اڑ گئے، بجلیاں ٹوٹ پڑیں، ہزاروں گھر، اپنے مکینوں کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئے۔ بادلوں سے پانی کے بجائے خون برسنے لگا، گلی کوچے اور بستیاں اس میں ڈوب گئیں، آدمی کے روپ میں درندے نکل پڑے، برسوں کی یاری و ہمسائیگی ایک بھی کام نہ آئی، سارے رشتے آن کی آن میں منقطع ہو گئے، باپ کے سامنے بیٹوں کی اور بھائی کے سامنے بہنوں کی عصمتیں لوٹ لی گئیں، ننگی، درندگی، حرص و ہوس، لوٹ مار اور قتل و خون کا ایسا بازار گرم ہوا کہ تہذیب انسانی شرم سے پانی پانی ہوگئی۔''[1]

غرض کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں جو درندگی پھیلی اور یہاں کا نظام فرقہ وارانہ فساد سے جو درہم برہم ہوا تو ادبا و شعرا، افسانہ نگار و ناول نگار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس زمانے میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ نظر آنے لگا اور ہندوستان کے

عوام وخواص اپنے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر ایک نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے جن کو اپنا ہدف اور مقصد معلوم نہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فرقہ ورانہ فساد اور یہاں کے انتشار و پراگندگی سے خوف زدہ ہو کر وہ بھی وطن کو چھوڑ کر چل دیئے۔ ان سارے حالات کو دیکھ کر نہ صرف اس عہد کے فنکاروں کے دل متاثر ہوئے بلکہ ان کی فکریں بھی مضطرب ہوگئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کا کوئی بھی ناول نگار ایسا نہیں ہے جس نے اپنے ناول میں تقسیم ہند اور فرقہ ورانہ فساد کو موضوع نہ بنایا ہو۔ حیات اللہ انصاری کے معاصرین میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، قاضی عبدالستار، راماننداساگر سبھوں نے اپنے اپنے ناولوں میں اس دردناک واقعہ اور اس کی تباہ کاریوں کا نقشہ پیش کیا۔ اب بھلا حیات اللہ انصاری کیسے ان حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ وہ تو تھے ہی ایک مصلح اور سماجی کارکن۔ ان کے دل پر ان حالات نے اتنا گہرا اثر ڈالا کہ انہوں نے نہ صرف راہ روی میں ناول لکھا بلکہ اردو ادب کا سب سے ضخیم ناول ''لہو کے پھول'' تحریر کیا۔ اس ناول میں بہت سے ضمنی موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے جیسے کسانوں کے مسائل، ہندوستان کی دیہی معاشرت، مزدوروں کا استحصال کرنے والے زمیندار و مہاجن وغیرہ۔ مگر یہ ناول جس حیثیت سے معروف ہے وہ ہے تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ فساد۔ اس میں جہاں انگریزوں کے مظالم، عدم تعاون کی بات ہے وہیں قومی آزادی کی جدوجہد، خلافت تحریک، ہندو مسلم فرقہ واریت اور سیاست، تقسیم ملک وغیرہ جیسے تار و پود ہیں جن سے پورا ناول تشکیل پاتا ہے۔ اس ناول میں انہوں نے فنی چابکدستی کے ساتھ تحریک آزادی، کانگریس، مسلم لیگ، گاندھی جی کے آندولن، ان کی موت، ستیہ گرہ وغیرہ بے شمار گوشے پیش کیے ہیں اور انہوں نے پوری جدوجہد آزادی کی فضا کو کامیابی کے ساتھ سمیٹنے اور خاص سیاسی و نظریاتی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ بقول نافع قدوائی:

> ''حیات اللہ انصاری نے اپنا یہ ضخیم ناول ''لہو کے پھول'' مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کے تناظر میں لکھا ہے لیکن کہیں بھی ان کے قلم نے اپنے نظریات کو تھوپنے میں خطابت اور ناصح کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے۔ اس ناول میں جنگِ آزادی کی تحریک کی بھرپور عکاسی ہوجاتی ہے گو کہ حیات اللہ انصاری مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو سے قریب ضرور ہے لیکن انھوں نے عملی طور پر جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا لیکن عملی طور پر بغیر جیل جائے انگریزی حکومت کی صعوبتوں کے خلاف جنگ آزادی کی تحریک کی ہر طرح سے مدد کی، لہو کے پھول میں کانگریس، مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی، کسانوں، مزدوروں، ٹریڈ یونینوں کی تحریکوں کی جیتی جاگتی تصویر کے ساتھ ناول میں عصری سماج اور سیاست کی بھی بھرپور تفصیل پیش کی ہے۔''[۲]

تقسیم کی آڑ میں جب ہر طرف فرقہ وارانہ فساد رونما ہوئے اور خوں ریزی کا بازار گرم ہوا تو حیات اللہ انصاری نے مذمت کی بلکہ انہوں نے اپنے قلم اور اپنے ضمیر کی آواز کو مظلوم انسانوں کی حمایت میں اور ظلم و استبداد، بربریت کے خلاف بلند کیا۔ انہوں نے اپنے ناول ''لہو کے پھول'' میں دوقومی نظریے اور فرقہ پرستی کی مذمت کی اور انسانیت کے جذبے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر محمد نسیم لکھتے ہیں:

> ''تقسیم ہند کے المیہ کے موضوع پر ''لہو کے پھول'' ایک اہم ناول ہے حیات اللہ انصاری نے تقسیم ہند کے کربناک پہلوؤں کو قلمبند کرنے میں نہایت ہی جرأت مندی اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔''[۳]

انگریزوں کے زمانے میں جو سماجی عدم مساوات اور ناانصافیاں تھیں اور کمزور لوگوں پر جو استحصال ہو رہا تھا حیات اللہ انصاری نے اسے دل سے محسوس کیا اور پھر انگریزوں کے خلاف اپنے قلم کے پرچم کو بلند کیا اور اپنی مختلف تحریروں سے بھی گاندھی کے عدم تشدد ان کے خیالات و نظریات کو ہندوستانی عوام تک پہنچایا اور خصوصیت کے ساتھ مسلم نوجوانوں کے ضمیر کو بیدار کیا اور ان کے دلوں میں ہندوستان کی آزادی کے لیے ہر طرح کی قربانی کے جذبے کو ہوا دی۔ تحریک آزادی کے حوالے سے انھیں مختلف صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے کبھی بھی گاندھی کے راستے اور ان کے نظریات سے روگردانی نہیں کی۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ وردھا آشرم میں رہے اور ان سے انسانیت کا درس لینے کے سبب انھوں نے فرقہ وارانہ فساد کی ہمیشہ مخالفت کی اور ہر طرف پیار محبت، قومی یکجہتی کا درس دیا۔ اور اپنی پوری حیات دوقومی نظریے کے خلاف جنگ کرنے میں وقف کردی۔ حیات اللہ انصاری آخر ایام تک کانگریس پارٹی سے منسلک رہے۔ کانگریس کے نظریات و خیالات مسلم لیگ سے بالکل مختلف تھے۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے ناول ''لہو کے پھول'' میں ان سارے خیالات کا ذکر اور فرقہ واریت کا ذکر شدت سے کیا ہے۔ اور مختلف کرداروں جیسے فرخ، سانوبی، سیتا، مولانا یاور، فریدہ وغیرہ کا ذکر اسی ضمن میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی، مولانا آزاد وغیرہ نے بھی کردار کی حیثیت سے اپنے مقاصد کی نمائندگی کی ہے۔ تقسیم ہند، فسادات اور فرقہ واریت کا منظر نامہ جو ''لہو کے پھول'' میں ملتا ہے وہ سب وہی ہے جو تاریخ کے اوراق میں مرقوم ہے۔ مگر حیات اللہ انصاری کی یہ تخلیقی ہنرمندی ہے کہ اسے بیانیہ انداز میں نہایت ہی سادہ اور سلیس انداز میں بیان کردیا ہے۔ اس ناول میں فسادات اور فرقہ واریت کے بہت سے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

ناول کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حیات اللہ انصاری نے ان سارے واقعات کو بعینہٖ دیکھا ہے اور اس کو ناول کے پیرایے میں بیان کردیا۔ انداز بیان اتنا دردانگیز ہے کہ پورا کا پورا واقعہ ہماری نگاہوں کے سامنے مجسم ہوجاتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس سے فرقہ واریت اور فسادات کا پورا منظر نامہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

> ''فریدہ اور فرخ بے حد غمگین تھے، لیکن زمانہ ایسا آگیا تھا کہ ان دونوں کا ذاتی غم ہندوستان کے غم میں ڈوب گیا اور ایک مہینے کے اندر سارا ہندوستان جوالامکھی بن گیا تھا۔ جگہ جگہ سے بھیانک فسادوں کی خبر آنے لگی، کلکتے میں ڈائرکٹ ایکشن پر بے حد ہولناک خوں ریزی ہوئی تھی لیکن اسی واقعہ سے اس مہینے کے بعد پھر وہاں فساد پھوٹ پڑا۔ اس کے بعد نواکھالی سے خبر آئی کہ وہاں مسلمانوں نے جو کہ بھاری اکثریت میں تھے اپنے پڑوسی ہندوؤں کو مار کاٹ ڈالا اور بھگا دیا۔ اور ان کی لڑکیوں اور عورتوں کو اٹھالے گئے۔ اس پر بنگالی اخباروں میں آگ لگ گئی گاندھی جی اس پر بے حد متفکر ہوئے اور ادھر بہار میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا گیا اور جو نواکھالی میں

ہوا تھا اس سے ڈیوڑھا کیا گیا۔ اس کے بعد پھر تو پٹیالہ، لاہور، امرتسر، صوبہ سرحد کے اضلاع ان سب میں آگ لگ گئی۔ گاندھی جی یہ تباہ کاریاں دیکھ کر خون کے آنسو رونے لگے ان کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ جو باغ انھوں نے اپنے خون اور پسینے سے زندگی بھر میں لگایا تھا وہ سب جل کر خاک ہوا جا رہا ہے۔''[۴]

انگریزوں سے برسوں کی آزادی کچھ دنوں کے لیے لوگوں کے دلوں کو مسحور اور فرحت بخشتی رہی اور ہر طرف خوشی کے شادیانے بجتے رہے، مبارکباد پہ مبارکباد پیش ہوتی رہی، مگر اس کی آڑ میں جو فساد برپا ہوئے اور دو قومی نظریے کا طوفان کھڑا ہوا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان ہندو کی جان کا پیاسا اور ہندو مسلمان کی جان کے درپے، ایک دوسرے کی عزتیں لوٹی جانے لگیں۔ وہ جو بھائی چارے کا ماحول تھا ایک ہندو مسلمان کی تھالی میں اور مسلمان ہندو کی تھالی میں کھاتا، ہر ایک کا کاروبار دوسروں سے چلتا تھا، سب کچھ برباد ہو گیا اور نفرت کی آگ میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے سے ملنا تو دور ذکر کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ چند دنوں کے بعد ماحول اس قدر خراب ہوا کہ مسلم مسلم لیگی اور ہندو کانگریسی کہے جانے لگے۔ اس بات نے لوگوں کے دلوں میں اس قدر نفرت کی آگ بھر دی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھڑپیں ہونے لگیں اور یہی جھڑپیں جب شدت اختیار کر لیتیں تو فرقہ واریت اور فساد کے روپ میں تبدیل ہو جاتیں۔ وہ علاقے جن میں مسلمان اور ہندو مل کر کاروبار کر رہے تھے، انھیں نظریات کی باعث ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور دونوں کے گھر اجڑ گئے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''فرخ ابھی جواہر لال نہرو کی اصول پرستی اور بہادری پر پوری طرح خوش بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس کے دل کو زبردست چوٹ پہنچی۔ وہ یہ کہ مرزا اور آفاق دونوں اس سے ملنے آئے مرزا تو خاموش رہا۔ آفاق کہنے لگا بھائی جان ہم لوگ آپ کو الوداع کہنے آئے ہیں۔ ہم نے طے کیا ہے کہ اب ترکِ وطن کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ابھی کچھ کہیے نہیں پہلے ہماری پوری بات سن لیجیے۔ بمبئی کے فساد کے بعد میری دکان ختم ہو گئی۔ ایک طرف تو ہندو خریدار آنا بند ہو گئے آپ کو شاید معلوم ہو کہ بمبئی میں چائے خانہ وہ چیز ہے جہاں چھوت چھات کبھی نہیں چلی لیکن فساد کے بعد سے ہندوؤں نے میری طرف آنا چھوڑ دیا۔ حد تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی عورتوں نے میرے گھر میں پناہ لی تھی وہ آ کر اظہارِ محبت اور شکریہ تو بہت ادا کرتے ہیں لیکن سامان نہیں خریدتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایسا کریں گے تو ان کا بائیکاٹ ہو جائے گا..... میرے چائے خانے میں بہت بڑی دکان تھی اور جیسا کہ کاروبار میں ہوتا ہے، سامان زیادہ تر کریڈٹ پر آتا ہے۔ فساد کے بعد ہندوؤں نے کریڈٹ دینا بند کر دیا ہے اور مسلمان سرمایہ دار پاکستان بھاگنے لگا اس طرح میری دکان پر سامان نہیں رہا اور دو مہینے اتنا بھاری گھاٹا ہوا کہ دکان بند کرنا پڑا۔''[۵]

ناول کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی جو تصویر ہمارے سامنے ابھرتی ہے اس میں فرقہ واریت اور فسادات اتنے خوفناک تھے کہ ایک طرف ہندو غنڈے اپنے کام کو انجام دے رہے تھے اور مسلمانوں پر ظلم و استبداد کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمان شر پسند ہندوؤں کے ساتھ وہی بے رحمانہ سلوک کر رہے تھے۔ نہ ان میں کسی قسم کا رحم تھا اور نہ کسی قسم کی مذہبیت و شرافت، ان میں انسانیت تو دور دور نظر نہیں آتی۔ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کرنا، برہنہ سڑکوں پر لا کر ان کے ساتھ نازیبا حرکت کرنا، بچوں اور ان کے باپ کے ساتھ سفاکانہ رویہ اختیار کرنا، مسلمان غنڈے اور ہندو غنڈے ان دونوں میں وجود باہمی کے اصول پر سمجھوتہ سا معلوم ہوتا تھا۔ خونریزی اور درندگی کا یہ ننگا ناچ اور فرقہ واریت کا طوفان نہ صرف مختلف شہروں میں تھا بلکہ قصبوں اور دیہاتوں تک نفرت کی آگ پھیل چکی تھی اور سارے گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے ناول ''لہو کے پھول'' میں فسادات اور درندگی کے واقعات کی المناک عکاسی کی ہے اور دونوں اطراف کے غنڈوں، شر پسندوں کی پُرزور مذمت کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناول میں فسادات اور فرقہ واریت کی تصویر کشی نہیں کی بلکہ تقسیم ہند کے اثرات سے فسادات اور فرقہ واریت کے جو اثرات ان کے ذہن و دل پر مرتب ہوئے ان کی بہترین عکاسی کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناول ''لہو کے پھول'' میں متعدد مقامات پر تقسیم، فسادات اور فرقہ واریت کے نمونے پیش کیے ہیں اور کسی نہ کسی واقعے میں ہندوستان کی آزادی کے بعد کی روداد بیان کی ہے۔ مگر ''لہو کے پھول'' کی پانچویں جلد خصوصیت کے ساتھ انھیں حالات پر مبنی ہے اور پوری جلد خونریزی، فسادات جیسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اگر ہم اس جلد کو فرقہ واریت سے منسوب کر دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس جلد میں جگہ جگہ فرقہ واریت اور تقسیم کے المیے کی تصویر کشی کی ہے۔ رام لال کی اولادوں میں ایک اولاد معصومہ تھی جس کو رام لال نے بچپن میں دیکھا تھا۔ وہ بابو جی نہیں کہہ پاتی تھی، اس کے منھ سے یہ لفظ 'بابو جی' نکلتا تھا۔ آزادی کے بعد تقسیم ہند و پاک اور فرقہ وارانہ فسادات نے جنم لیا جہاں ہر طرف انسانیت دم توڑ رہی تھی۔ ہر طرف قتل و غارت گری ہو رہی تھی۔ عورتوں کی عصمت گاہے گاہے لٹ رہی تھی۔ رام لال مسجد پر قبضہ کر کے مسلم مہاجرین کی مال و آبرو کو لوٹ رہا تھا۔

یہ واقعہ انسانیت پر ایک دھبہ ہے۔ باپ جو لڑکی کا محافظ ہوتا ہے وہی باپ اپنی ہی بیٹی کی عصمت دری کرتا ہے۔ یہ واقعات ۱۹۴۷ء کے فسادات کے سچے ترجمان ہیں۔ فرقہ واریت، فسادات کی جو منظر کشی حیات اللہ انصاری نے کی ہے شاید ہی کسی دوسرے مصنف کے یہاں ملتی ہو۔ حیات اللہ انصاری آخری حصہ یعنی پانچویں باب میں تقسیم ہند کی فرقہ واریت اور فسادات کی تصویر کشی میں کامیاب نظر آئے ہیں۔ یہ اقتباس کو پیش کرنے سے قبل یہ ذکر کرنا لازمی ہے کہ بختیار نے طربیہ کو بمبئی میں دیکھا تھا جو بے انتہا خوبصورت تھی جو تقسیم ہند کے فسادات کی نذر ہو گئی۔ بختیار چہرہ دیکھنے کے بعد سرجن شفقت کے کہنے پر طربیہ کے جسم کو دیکھتا ہے:

حیات اللہ انصاری نے اپنے ناول میں ان شر پسندوں کی منصوبہ بندی کا بھی ذکر کیا کہ کس طرح وہ جگہ جگہ فسادات برپا کریں گے اور موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے کام کو انجام دیں گے ایک دن جب اس کے اہم کردار مہاراج کے یہاں کچھ شر پسند چاقو، کلہاڑی، بندوق، مٹی کا تیل اور پٹرول وغیرہ کے ساتھ داخل ہوتے ہیں یہ لوگ گنگا رام اور مہاراج

کے معتقدین میں سے ہیں اور ہر طرف انھیں کے بتائے ہوئے لوگوں پر حملہ کرتے ہیں اور سارے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ اب یہ سارے شر پسند اپنے اوزاروں کے ساتھ فساد اور قتل وغارت کے لیے تیار تھے ان میں ایک نے سارے شر پسندوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ یہ سورما ملک کو جیتنے اور اسے مسلمانوں سے آزاد کرانے کے لیے کافی ہیں اور بلند تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا کاش ایسے سورما اور بھارت ماتا کے سپوت محمود غزنوی کے سامنے ہوتے تو بتاتے کہ ہم کیا ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے وطن پاکستان ڈھکیل کر ہی دم لیں گے۔ اور پھر سنچالک نے ان میں جوش و جذبہ بھرنے کی غرض سے کہا کہ اگر تم لوگوں نے مسلمانوں کو مار کاٹ دیا اور انھیں ان کے وطن پاکستان بھیج دیا تو جان لو تم سب کو اس کامیابی پر انعام کے طور پر مسلمانوں کی جائداد، جاگیریں اور ان کی لڑکیاں، بہو، بیٹیاں تحفے میں ملیں گی۔ حیات اللہ انصاری نے ان حالات کا بیان اور ان شر پسندوں کی اسکیم کو کس انداز میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ”ہم اپنے آدمیوں کو تین ٹکڑوں میں بانٹ دیں گے ایک ٹکڑی تو یہ چلاتی بھاگے گی مسلمانوں نے مار ڈالا، مسلمانوں نے مار ڈالا، دوسری ٹکڑی جو ہندو محلوں میں رہتی ہے اپنے اپنے کوٹھوں پر سے یہ آواز سن کر پکارے گی ہندو سورماؤ آگے بڑھو، دشمنوں سے بدلہ لو، تیسری ٹکڑی ہماری سنتھا کے والنٹیروں کی ہوگی جو مسلمان بن کر مسلمان محلے سے بھاگے گی، کوران پڑھے گی، اسلامی نعرے لگائے گی اور کہے گی مسلمانوں اپنی عورتوں کی عزت چاہتے ہو تو بھاگو بھاگو پھر ہمارے خاص آدمی جو دوسری جگہ موجود ہوں گے وہ نکل آئیں گے، دھما کہ کریں گے اور کچھ ایسی باتیں کریں گے کہ بستی میں ہنگامہ ہو جائے گا اس وقت مہاراج ہم ہندوؤں کو منظم کر کے وہ کریں گے جو ہم چاہتے ہیں۔“[۶]

حیات اللہ انصاری کے ناول ”لہو کے پھول“ میں تقسیم اور فرقہ واریت کا المیہ ایک اہم موضوع بن کر سامنے آتا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے اس ناول میں تقسیم اور فرقہ وارانہ فساد کو فطری سطح پر غیر فطری بتایا ہے اور مولانا آزاد کی طرح دو قومی نظریات کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ جس نے نہ صرف ملک کو تقسیم کیا بلکہ ہندوستان کو تقسیم کر کے سیکڑوں، لاکھوں لوگوں کے خاندان کو برباد کر دیا اور خونی رشتوں میں دوریاں پیدا کر دیں جس کے نتیجے میں لاکھوں لوگوں نے اپنی قربانی پیش کی اور قتل وغارت گری اور خونریزی کی بھینٹ چڑھ گئے اور کروڑوں لوگ اجڑ گئے۔ حیات اللہ انصاری نے اس ناول میں حقیقی تصویر پیش کرنے اور حقیقت کو بیان کرنے کے بجائے لوگوں کو نصیحت اور تبلیغ کی ہے۔ اس ناول میں انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش کو ہیرو اور وطن کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ناول ”لہو کے پھول“ کی پانچویں جلد میں آزادی کے بعد والے باب میں جب فرخ مجھر نگر جاتا ہے تو ایک بوڑھا مسلمان جو کانگریس کا فالوور اور حامی ہے، اس سے کہتا ہے:

> ”ہم تو چاہتے ہیں کہ کوئی جماعت ایسی ہو جو ہم کو بیوپاریوں اور مہاجنوں اور تھوک فروشوں اور نوابوں سے نجات دلوائے۔ یہ کام نہ تو مسلم لیگ سے ہو سکتا ہے اور نہ ہندو مہاسبھا سے کیونکہ یہ بیوپاری اور مہاجن ان جماعتوں میں گھسے ہوئے ہیں اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو کانگریس سے لیکن اب تو بیوپاری اور مہاجن ان سے بھی میل جول پیدا کر رہے ہیں۔“[۷]

حیات اللہ انصاری نے اس ناول میں ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک کے حالات کو بیان کیا ہے۔ اس عہد کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے حیات اللہ انصاری نے آزادی کی کہانی اور اس کی جدوجہد کی جو روداد بیان کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے حوالے سے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جو ایک بات قارئین کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ تقسیم کے حوالے سے جو واقعات رونما ہوئے ان میں کانگریس نہیں بلکہ مسلم لیگ ذمہ دار تھی۔

الغرض حیات اللہ انصاری کے اس ناول پر نگاہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس عہد کی موجودہ برائیوں اور تقسیم ہند کے حالات پیدا کرنے والوں پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ تقسیم اور فسادات پر کرشن چند، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر وغیرہ نے اچھے ناول لکھے ہیں۔ لیکن حیات اللہ انصاری نے لہو کے پھول میں تقسیم ہند و اور فسادات کے المیے کو جتنی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اپنے مشاہدات کو جس طرح تحریری جامہ پہنایا وہ ہنر اور تخلیقیت دوسروں کے یہاں مفقود ہے۔ یہ ناول پڑھ کر اس عہد کا پورا ہندوستان ہماری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جاتا ہے۔

حواشی:

۱۔ اردو افسانہ: سمت ورفتار کی روشنی میں، مشمولہ اردو افسانہ اور افسانہ نگار، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔ ۱۹۸۲ء، ص ۹۱۔

۲۔ مونوگراف حیات اللہ انصاری، نافع قدوائی، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۴ء، ص ر ۱۷۔ ۷۰۔

۳۔ ڈاکٹر محمد نسیم، اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیہ کے اثرات، ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ر ۱۴۔

۴۔ ناول لہو کے پھول (پانچویں جلد) حیات اللہ انصاری، کتاب دان لکھنؤ، ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۷۸۔ ۲۲۷۹۔

۵۔ ایضاً، ۲۳۲۵۔ ۱۳۲۴۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۴۶۰۔

۷۔ ایضاً۔ ۱۳۲۴

❑❑❑

التماس

”ماہنامہ نیا دور“ میں جن لوگوں کی ممبر شپ ختم ہو گئی ہو وہ زرِ سالانہ ارسال کرنے کی زحمت کریں جس سے ان کو رسالہ آئندہ بھی مستقل ارسال کیا جا سکے۔

ڈاکٹر درخشاں انجم

لکچرر شعبۂ اردو، رانی گنج گرلس کالج (مغربی بنگال)

9851289804

''گیہوں اور گلاب'' کا تجزیاتی مطالعہ

''زندگی میں گیہوں ہی سب کچھ نہیں ہوتا گلاب کے پھولوں کی بھی کوئی اہمیت ہے۔'' مگر اوشا کی خفگی اس وقت دور ہو جاتی ہے جب دیپ کمار اور اداکارانی ''نیا ہندوستان'' کی شوٹنگ کے سلسلے میں اس کے شوہر کے فارم میں آتے ہیں جہاں فلم کی شوٹنگ کے فوراً بعد بارش شروع ہو جاتی ہے اور بارش سے گیہوں کی فصل کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے رمیش کے ساتھ گاؤں کے کسان، دیپ کمار اور اس کے سارے اسٹاف کھیتوں میں اتر آتے ہیں۔ جسے دیکھ کر اوشا کو اپنی کم ظرفی کا احساس ہوتا ہے کہ آج جب سب لوگ کام کر رہے ہیں وہ کھیت کی مینڈھ پر بے کار کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہے۔ لہٰذا وہ بھی درانتی لے کر کھیت میں گیہوں کی کٹائی کرنے آجاتی ہے۔ مگر اوشا کے لیے درانتی چلانا کھیتوں میں گلاب کے پودے لگانے سے زیادہ محنت کا کام نکلا اور اُس دن اسے اپنے شوہر کی جدو جہد، عمل پیہم اور بے لاگ محنت کا احساس ہوا ساتھ ہی گیہوں کی اہمیت کا اندازہ بھی۔''

ہر شاعر، ہر ادیب، ہر فن کار اپنی تہذیب و تمدن، معاشرت و ماحول کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا، سنتا محسوس کرتا ہے اسے ہی لفظوں کا جامہ پہنا کر اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے۔ چاہے وہ شاعری ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا افسانہ ہو۔ کچھ ایسے ہی گرد و پیش کے اثرات خواجہ احمد عباس نے بھی قبول کیے اور بے شمار افسانے خلق کیے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر ہمیں جہاں آزادی سے پہلے کے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور طبقاتی حالات کا علم ہوتا ہے وہیں آزادی کے بعد ملک میں ہونے والی خاطر خواہ ترقی کا مبصرانہ تجزیہ بھی بہ خوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بالخصوص سائنسی ایجادات، جدید آلات کی وجہ سے صنعتی میدان میں، زراعتی شعبوں میں، انسانی زندگی میں، لوگوں کے سوچ بچار میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، جو انقلاب برپا ہوا اس کا علم بھی ان کے افسانوں کو پڑھنے سے ہوتا ہے۔ ان کا افسانہ ''گیہوں اور گلاب'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس افسانے کا یہ اقتباس پیشِ خدمت ہے:

> ''انقلاب وہ نہیں تھا جو سیاست دانوں نے اپنی دھواں دھار تقریروں سے برپا کیا بلکہ انقلاب وہ ہے جو اس کی فارم کی مشینیں اب کسانوں کی زندگی میں برپا کر رہی ہیں۔ وہ مشینیں جو ہمیشہ کے لیے کسانوں کو جانوروں کی طرح مشقت کرنے کی مجبوری سے آزاد کر رہی ہیں۔ جو ملک کی زراعتی پیداوار میں بڑھا رہی ہیں۔ جو ہندوستان کے دیہات کا نقشہ بدل رہی ہیں۔''

افسانہ ''گیہوں اور گلاب'' ان کے افسانوں کے چھٹے مجموعے ''گیہوں اور گلاب'' سے اخذ شدہ ہے۔ اس کی سن تصنیف ۱۹۵۵ء ہے۔ رمزیت اور اشاریت سے پر یہ ایک قسم کا فلمی افسانہ ہے۔ اس کا تانا بانا خواجہ احمد عباس نے فلمی انداز میں بنا ہے۔ اس میں حقیقی دنیا سے تعلق رکھنے والے ہیرو ہیروئین رمیش، اوشا کے علاوہ فلمی دنیا کے جانے مانے اداکار دیپ کمار اور اداکارانی بھی ہیں جس کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔

خواجہ احمد عباس کا یہ افسانہ مثالی نہ سہی مگر دھیرے دھیرے کروٹ بدلتی ہندوستانی معیشت کی سچی تصویر ضرور ہے۔ اس افسانے میں خواجہ احمد عباس نے رمیش کو نئے ہندوستان میں نئی سوچ رکھنے والے فرد کی حیثیت سے ابھارا ہے جو ہر دم ملک کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ امریکہ سے ایگریکلچر (Agriculture) کی ڈگری لے کر آیا ہے اور اپنے ملک ہندوستان میں گیہوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے نت نئے تجربے کیا کرتا ہے تاکہ دیش میں گیہوں کی پیداوار بڑھے اور گیہوں کو کیڑے مکوڑے نہ کھائیں۔

> ''صبح سے شام تک تو دفتر میں سر کھپاتے ہو سمجھ میں نہیں آتا تمھیں ریسرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اوشا نے چھوٹتے ہی کہا جب رمیش نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ فتری کام تو میں مجبوری میں کرتا ہوں اوشا! صرف اپنا اور تمھارا پیٹ پالنے کے لیے ورنہ ہمیشہ سے میرا ارادہ زراعت کے مختلف مسئلوں پر ریسرچ کرنے ہی کا تھا۔ کیوں کہ گیہوں کے پودوں کو جو کیڑے مکوڑے کھا جاتے ہیں ان کی روک تھام کے لیے میں ریسرچ کرنا چاہتا ہوں۔'' (اقتباس)

اس کے لیے وہ لکھنؤ کے سکریٹریٹ کو چھوڑ کر دہلی کے قریب گورنمنٹ کے ایک تجرباتی فارم کو سنبھالنے آجاتا ہے۔

جہاں میلوں تک کھیت ہی کھیت رہتا ہے اور رمیش کے تجرباتی کام کے لیے بہترین جگہیں اور مواقع بھی۔ مگر یہ بات رمیش کی بیوی اوشا کو پسند نہیں آتی کہ اس کا شوہر محض پانچ سو(۵۰۰) روپے کی سرکاری نوکری کی خاطر دن رات جھک مارے اور وہ اپنی زندگی گیہوں کی بالیوں کے بیچ گزارے۔ اس لیے کہ وہ اپنے اردگرد گیہوں کی بالی نہیں گلاب کی کیاری دیکھنے کی خواہاں تھی۔ درحقیقت اوشا لکھنؤ کے ایک تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانے کی شوخ مزاج لڑکی ہے، جس کی دنیا پارٹی، سینما اور گلاب کے رنگین پودے تک محدود ہے۔ اسی لیے وہ بعض اوقات اپنے شوہر سے خفا بھی رہتی ہے۔ دیکھیے ایک اقتباس:

"سنا تم نے اوشا" رمیش نے بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا "کٹائی کرنے میں ہمارا فارم تو سب سے آگے ہے۔ ان فلم والوں نے بار بار ٹریکٹر کو روکا یا نہ ہوتا تو آج ہی ساری فصل کٹ جاتی۔ مجھے اُمید ہے کہ گیہوں کی پیداوار میں ہمارا فارم سب پر بازی لے جائے گا۔ "فصل، ٹریکٹر، گیہوں، کٹائی کیا ان کے علاوہ دنیا میں کوئی اور بات ہی نہیں رہ گئی ہے کبھی میرا بھی خیال کیا کرو " ۔۔۔۔اس لیے کہ زندگی میں گیہوں ہی سب کچھ نہیں ہوتا گلاب کے پھولوں کی بھی کوئی اہمیت ہے۔" مگر اوشا کی خفگی اس وقت دور ہو جاتی ہے جب دیپ کمار اور الکا رانی "نیا ہندوستان" کی شوٹنگ کے سلسلے میں اس کے شوہر کے فارم میں آتے ہیں جہاں فلم کی شوٹنگ کے فوراً بعد بارش شروع ہو جاتی ہے اور بارش سے گیہوں کی فصل کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے رمیش کے ساتھ گاؤں کے کسان، دیپ کمار اور اس کے سارے اسٹاف کھیتوں میں اتر آتے ہیں۔ جسے دیکھ کر اوشا کو اپنی کم ظرفی کا احساس ہوتا ہے کہ آج جب سب لوگ کام کر رہے ہیں وہ کھیت کی مینڈھ پر بے کار کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہے۔ لہٰذا وہ بھی درانتی لے کر کھیت میں گیہوں کی کٹائی کرنے آجاتی ہے۔ مگر اوشا کے لیے درانتی چلانا کھیتوں میں گلاب کے پودے لگانے سے زیادہ محنت کا کام نکلا اور اُس دن اسے اپنے شوہر کی جدوجہد، عمل پیہم اور بے لاگ محنت کا احساس ہوا ساتھ ہی گیہوں کی اہمیت کا اندازہ بھی۔ دیکھیے ایک اقتباس:

"اس کے قریب گوری کے چھوٹے بھائی بہن منّو اور رجی چھوٹی چھوٹی درانتیاں لیے کام کر رہے تھے۔ اور کھیت کی مینڈھ پر کھڑی اوشا سب دیکھ رہی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سب کام کر رہے ہیں اور وہ بیکار ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت کانپتے ہاتھوں سے درانتی چلا رہی ہے۔ شاید اس کی چندھی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اوشا نے سوچا:

کہیں یہ بے چاری اپنا ہاتھ نہ کاٹ لے۔ "لاؤ ماں جی! مجھے دو۔ تم آرام کرو۔" اس نے بڑھیا سے درانتی کو چھینتے ہوئے کہا۔ مگر اسے جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ کٹائی کا کام جو دیکھنے میں بہت ہی آسان معلوم ہوتا تھا اتنا آسان نہیں ہے۔"

رمزیت اشاریت سے پُر خواجہ احمد عباس کا افسانہ "گیہوں اور گلاب" کا اگرچہ معنوی اعتبار سے کوئی میل نہیں ہے تاہم خواجہ احمد عباس نے اتنی فنکاری اور چابکدستی سے ان دونوں کے درمیان تال میل دکھایا ہے کہ اس سے نہ صرف زندگی میں ان دونوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے بلکہ ہم پر یہ راز بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ جب تک آسائش کا جذبہ، عمل اور جدوجہد پر حاوی ہے سارے ترقیاتی پروگرام بے روح ہیں۔ کیوں کہ زندگی محض پھولوں پر سے گزرنے کا نام نہیں بلکہ کانٹوں پر چلنے کا نام بھی ہے۔۔۔!

حوالہ جات:

۱) افسانہ اور افسانوں کا مجموعہ "گیہوں اور گلاب"، خواجہ احمد عباس، ۱۹۵۵ء
۲) رسالہ "آجکل" ۱۹۸۷ء
۳) "اگر مجھ سے ملنا ہے" منتخب افسانے خواجہ احمد عباس۔ ۲۰۱۴ء

❑❑❑

غزل

خوشی تمہیں بھی نہیں ہے اداس تم بھی ہو
بچھڑ رہے ہو مگر بدحواس تم بھی ہو

لگی ہوئی ہے جہاں بے وفائی کی دیمک
اُسی کتاب کا اک اقتباس تم بھی ہو

دلاسا دیتا ہوں ہر بار بے یقینی کو
یہ بات سچ ہے، مری جھوٹی آس تم بھی ہو

صبا بھی، غنچہ و گُل بھی طواف کرتے ہیں
چمن میں موسمِ گُل کا لباس تم بھی ہو

اُٹھا، اور اٹھ کے مرے پاس آیا جانِ بزم
کہا! کہ محفل جاناں میں خاص تم بھی ہو

یہ دیکھو! ہجر کی شاخوں پہ دو شگفتہ پھول
اکیلا کب ہوں یہاں میرے پاس تم بھی ہو

فریب کھا گئے جاویدؔ اُس پری رو سے
تمہیں تو دعویٰ تھا، چہرہ شناس تم بھی ہو

جاوید اکرم فاروقی
یاسمین منزل مغل گارڈن متقی پور، لکھنؤ
8127855655

ڈاکٹر فتح عالم

اے۔8 گلیکسی اپارٹمنٹ،قلعہ روڈ شمشاد مارکیٹ،سول لائن،علی گڑھ

8218656661

ترقی پسند ناولوں میں ہیئت اور تکنیک

اردو ناولوں میں ابتدا سے ہی تکنیک کی سطح پر کافی تنوع اور رنگارنگی نظر آتی ہے۔حالاں کہ بیشتر ناول نگاروں نے روایتی تکنیک سے انحراف برتنے کی کوشش نہیں کی ہے۔اس کے باوجود یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کچھ جدید تکنیک اور تجربے کا اظہار ناولوں میں ہوتا رہا ہے جو انہیں مغربی ناولوں کے قریب لے جاتا ہے۔ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد اردو ناولوں میں زندگی اور اس کے مسائل کے جن نئے تقاضوں کو موضوع بنایا گیا وہ پہلے کے ناولوں میں ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ نئے علوم،نظریات وتصورات اور عصری شعور نے ناول نگاروں کے ذہن کو وسعت،بالیدگی اور تنوع عطا کیا جس کے نتیجے میں اردو ناولوں میں موضوع اور اسلوب کی سطح پر ثروت مندی کا احساس ہوتا ہے۔

پریم چند کا فن جس اعلیٰ تکمیلی سطح تک پہونچ کر اپنی عظمت کا اعلان کرتا ہے ترقی پسند فکشن اسی مقام سے اپنا آغاز کرتا ہے۔ ترقی پسند فکشن کی شناخت یہی ہے کہ اس نے سماجی، معاشی، سیاسی، جنسی،نفسیاتی امور اور مسائل کو برتنے کے علاوہ ہیئت، اسالیب اظہار اور پیشکش کی نئی تکنیکوں سے متعارف بھی کرانے کی جسارت کی۔سجاد ظہیر سے لے کر عہد جدید کے ترقی پسند ناول نگاروں نے زندگی اور سماج کے تقریباً تمام پہلوؤں کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔اس عہد کے ناول نگاروں نے اپنے تجربات، مشاہدات اور موضوعات و مواد کی پیش کش کے لئے متنوع اور جداگانہ تکنیک اور ہیئت کو اختیار کیا۔ بالخصوص شعور کی رو اور تحلیل نفسی کی تکنیک کے ذریعے انھوں نے اردو ناولوں میں قابل قدر اضافے کئے۔ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کرداروں کی فطرت، ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیت کو سمجھنے کے لئے کیا جاتا ہے۔اس تکنیک میں ناول نگار کرداروں کی ذہنی فضا، اس کی داخلی دنیا اور اس کی بدلتی ہوئی لہروں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کردار کا ظاہر و باطن سبھی کچھ اس کے خیالات و احساسات کی رو میں سامنے آجاتا ہے۔

اردو ناول میں اس تکنیک کا استعمال سب سے پہلے سجاد ظہیر نے اپنے ناول ''لندن کی ایک رات'' میں کیا تھا۔اس کے بعد اس عہد کے دوسرے ناول نگاروں نے بھی اس تکنیک سے کام لیا ہے۔عزیز احمد کے ناول ''گریز''، کرشن چندر کے ناول ''شکست'' اور عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' میں بھی اس تکنیک کا استعمال جا بجا ملتا ہے۔تحلیل نفسی کی تکنیک کے ذریعہ اس عہد کے تمام ناول نگاروں نے کرداروں کو ان کی جنسی اور نفسیاتی تجربے کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس تکنیک کے ذریعہ کرداروں کو ان کے شعور اور لاشعور کے پیچیدہ عمل اور ردِعمل کے ذریعہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس میں ناول نگار اپنے عمیق مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ داخلی حقیقت کا رنگ بھرتا ہے۔اس عہد کے ناول نگاروں نے داخلی اور خارجی دونوں زندگی کی حقیقتوں کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کی ہے جس میں فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی اور داخلی خود کلامی کو بروئے کار لاتے ہوئے داخلی زندگی کی حقیقتوں اور نفسیاتی گتھیوں کو پیش کرنے کی جانب توجہ بڑھی۔اس تکنیک کے ذریعہ جنسی زندگی کے حقائق کو بھی پہلی دفعہ کھل کر پیش کرنے کی روایت قائم ہوئی۔

پریم چند نے اردو ناول کو جس مقام تک پہنچا دیا تھا ترقی پسند ناول نگاروں نے وہاں سے اپنا سفر شروع کیا اور اسے سماجی، سیاسی، معاشی، جنسی اور نفسیاتی حقائق اور حالات و اقدار کی پیش کش اور ان اقدار میں ہو رہے تغیر اور تصادم کی عکاسی کو متحمل بناتے ہوئے موضوعات و مواد اور تکنیک کے نت نئے امکانات سے ہمکنار کیا۔ان ناول نگاروں میں سب سے پہلا نام

''متوسط طبقے کی محرومی، ناکامی، بیکاری عصمت کے ہاتھوں ڈھل کر کہیں ناول، ناولٹ تو کہیں افسانہ، ناٹک اور خاکہ کے روپ میں نظر آتی ہے۔عصمت چغتائی نے اپنے مخصوص لب ولہجہ اور تکنیک سے اپنی ابتدائی تحریروں سے ہی قاری کو چونکا دیا اور سب نے محسوس کیا کہ ادبی دنیا میں ایک نئے فنکار کا ورود ہوا ہے۔جس کے پاس کہنے کو کچھ نئی باتیں ہیں۔عصمت چغتائی نے کئی ناول لکھے جن کے نام ''ضدی''، ''ٹیڑھی لکیر''، ''معصومہ''، ''رسوائی''، ''سودائی''، ''عجیب آدمی'' اور ''دل کی دنیا'' قابل ذکر ہیں۔ ''ضدی'' کا شمار ان کی اولین تخلیقات میں ہوتا ہے۔جس کی اہمیت عصمت کے اوّل ناولٹ ہونے سے زیادہ نہیں ہے۔ان کے ناولوں میں سب سے اہم ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ہے۔یہ ناول سوانحی انداز کا ہے۔اس میں ایک کردار کا مطالعہ بچپن سے لے کر جوانی تک اس تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اردو ناول نگاری میں آپ اپنی مثال ہے۔''

سجاد ظہیر کا ہے جنھوں نے ''لندن کی ایک رات'' لکھ کر ترقی پسند ناولوں کی جہاں بنیاد مستحکم کی وہیں ''شعور کی رو'' کی تکنیک سے اردو ناول کو روشناس کرایا۔ بقول یوسف سرمست ــــ

''لندن کی ایک رات'' اردو کا اہم اور اچھوتا ناول ہے۔ اردو میں نہ
صرف جدید ناول نگاری کی ابتداء اس سے ہوتی ہے بلکہ اس ناول سے اردو
ناول نگاری شعور کی رو کی تکنیک سے سب سے پہلے متعارف ہوتی ہے۔''[1]

سجاد ظہیر اس سے قبل شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال ''انگارے'' کے افسانوں میں کر چکے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس تکنیک سے بخوبی واقف تھے۔ سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' کی تخلیق سے قبل جیمس جوائس کی یولیسس کا مطالعہ کیا تھا کیوں کہ ''لندن کی ایک رات'' میں ناول ''یولیسس'' کے اثرات اور اسلوب کی گہری چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک پہلی بار اس ناول میں جزوی طور پر برتا گیا ہے۔

اس کہانی میں لفظ ''رات'' کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ یہ رات لاشعور کی علامت ہے تو ساتھ ہی تاریکی اور غیر محفوظ مستقبل کا بھی سمبل بن جاتا ہے۔ رات فرد کو اس کے عزم و ارادے کی دنیا سے نکال کر بیچارگی اور مایوسی کی حالت میں پہنچا دیتی ہے۔ رات جو تاریکی اور تباہی کی علامت ہے۔ اس ناول میں خواب پریشان بن کر انتشار کو پیش کرتی ہے۔ یہ خواب عصرِ حاضر کی دین ہے۔ اس عہد میں ہندوستان اور بین الاقوامی سطح پر جنگ سے جو حالات و واقعات رونما ہوئے تھے اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ کل کیا ہوگا۔ ناولٹ میں تفصیلات کے بجائے ایجاز و اختصار درکار ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر نے فنی چابکدستی سے پوری تباہی و بربادی کو صرف ایک رات میں سمیٹ دیا ہے۔ یہی کہانی کا مرکز ہے۔ اسی رات کے پس پردہ ناول کے تمام کرداروں کے ذہنی انتشار کا کارواں رواں دواں ہے۔ پوری کہانی کے سوتے یہیں سے پھوٹتے ہیں اور پوری کہانی کا تانا بانا اسی سے بُنا گیا ہے جہاں ایک رات کا قصہ پھیل کر کروڑوں ہندوستانیوں کی کہانی بن جاتا ہے۔ اس لئے اس ناول کو نظریاتی سطح کے علاوہ فکری سطح پر بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اس کا پلاٹ عام ناولوں سے مختلف ہے۔ شعور کی رو (Stream of Consciousness) کی تکنیک کی وجہ سے ناول میں کوئی مربوط اور منظم کہانی نہیں ابھرتی۔ واقعات میں بظاہر کوئی تسلسل نہیں ہوتا اور نہ کوئی ارتقا معلوم ہوتا ہے۔ پلاٹ بالکل ہلکے پھلکے انداز میں محسوس ہوتا ہے جس کی گرفت میں چھوٹی سی چھوٹی تفصیل آجاتی ہے جس کا بہاؤ وقت اور ماحول میں ہوتا ہے۔

''لندن کی ایک رات'' میں سجاد ظہیر نے شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال، خود کلامی اور فلیش بیک کی تکنیک کے استعمال سے ناول کے تمام کرداروں کے مختلف و متضاد نفسیاتی و ذہنی کیفیتوں کو ناول کے اس چھوٹے سے کینوس پر بکھیر دیا ہے جہاں یہ کردار صرف ہندوستان ہی کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ پوری دنیا میں جو اضطراب و ہیجان پیدا ہوگیا تھا اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ترقی پسند ناول نگاروں میں عزیز احمد کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ بیک وقت ناول نگار بھی تھے، افسانہ نگار بھی اور نقاد بھی۔ انھوں نے اردو ناول نگاری میں نہ تو روایت کی پیروی کی اور نہ ہی روایت سے بغاوت تو آخر وہ کون سی چیز تھی جس نے عزیز احمد کو ناول کی دنیا میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

دراصل عزیز احمد نے مواد، ہیئت اور اسلوب کو ہم آہنگ کر کے اپنے مخصوص انداز میں اردو ناول کو ایسے تجربات سے متعارف کرایا جن سے اردو ناول اس سے پہلے روشناس نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے جنس اور عشق کے پردے میں ان تمام رجحانات اور مسائل کو جن میں فرسودہ رسم و رواج، ماحول اور جدید علوم شامل ہیں، بے باکی کے ساتھ بیان کر دیا۔ یہی ان کی جدت پسندی کا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے ان کے ناول نئی تکنیک کے نقطۂ نظر سے شاہ کار سمجھے جاتے ہیں۔

عزیز احمد کا ناول ''گریز'' اپنے فنی لوازم کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں جنسیت کے ساتھ کھلے پن کا اظہار ضرور ہے مگر یہ اُس دور کی ضرورت اور سیاسی و سماجی صورتحال کی پیشکش ہے۔ اس ناول میں نفسیات کے حوالے سے پہلی بار فرائڈ کے نظریات کو تخلیقی سطح پر برتنے کی بہتر کوشش کی گئی ہے۔ اس میں مشرق و مغرب کا تصادم، متوسط طبقے کی نفسیات، پیچیدگیوں اور جنسی رویوں کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے جنس سے پیدا شدہ مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ چونکہ اس ناول میں مغرب (لندن) کے اس ماحول کا ذکر ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد اپنے منتشر شیرازے کے ساتھ موجود ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' کی طرح اس میں بھی کردار طالب علم لندن میں مقیم ہیں۔ عزیز احمد نے ''گریز'' میں زندگی کے بے شمار پہلو پیش کئے ہیں۔ انھوں نے جنسی اور روحانی محبت کو نئے علوم کی آگہی کو بھی پیش کیا ہے۔ اشتراکی اور اشتمالی خیالات کو بھی پھیلتے ہوئے دکھایا ہے۔ ہندوستان اور بین الاقوامی سطح کے مسائل اور پہلی جنگ عظیم کے پیدا کردہ مسائل اور دوسری جنگ عظیم کے خطروں کی عکاسی کی ہے۔

ایک ناول میں زندگی کے اتنے مسائل کا احاطہ کرنا نہایت ہی مشکل امر ہے۔ سیدھا سادہ قصہ اور بیانیہ سپاٹ انداز تو اس کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک کامیاب ناول نگار کی طرح عزیز احمد نے شعور، تحت الشعور، داخلی خود کلامی کے ذریعہ انسانی نفسیات کی تحلیل کی اور سارے موضوعات کو ایک لڑی میں پرو کر رکھ دیا۔ اس سے پلاٹ میں جھول نہیں پیدا ہوا۔ واقعات میں خلا پیدا ہونے کے بجائے ایک نوع کا منطقی ربط قائم ہوگیا۔ کردار کی تہوں میں قاری کو اترنے کا موقع ملا اور ناول کو گہرائی و وسعت نصیب ہوئی۔ جیسے کہ اس ناول میں اکثر مقامات پر واحد متکلم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو ڈرامائی صورت حال کو جنم دیتا ہے۔

خطوط، خود نوشت، ڈائری کے ذریعہ کردار کی تحلیل نفسی اور جذباتی و نفسیاتی کیفیت کا یہ طریقہ جس طرح عزیز احمد نے استعمال کیا اسے کوئی دوسرا برتنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح ''آگ'' کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی مسلسل اور مربوط کہانی نظر نہیں آتی۔ نہ تو ہیرو ہیروئن کے مرکزی کردار ناول میں گردش کرتے ہیں اور نہ پلاٹ کا تسلسل اور باضابطگی ہے۔ عزیز احمد ''آگ'' میں بالکل نیا انداز اختیار کیا ہے اور بندھی ٹکی تکنیک کے تتبع سے گریز کیا ہے اور کشمیر کی تہذیب، اس کی زندگی کی تفصیل اور جزئیات ہی ناول کا حصہ اور مرکز ہیں۔ خود راوی اس کا اعتراف کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو ــــ

''میں واحد متکلم اجنبی ملک کا رہنے والا ــــ اس سرزمین میں میں
ہیروئن کہاں سے ڈھونڈوں جہاں سوائے مزدور عورتوں کے دوسرے
طبقے کی عورتیں سڑکوں پر چلتی پھرتی دکھائی نہیں دیتیں۔ دکانوں میں
سودا نہیں خریدتیں۔ ڈنگوں میں بیٹھ کر باغوں کو ضرور جاتی ہیں مگر ان
کے ساتھ ان کے مرد ہوتے ہیں جو ان کی ہر اٹھتی نگاہ، ان کی گردن کی

ہر جنبش، ان کے برقعے کی ہر شکن پر احتساب کرتے ہیں۔'' ۲

''آگ'' کے بعد عزیز احمد نے ''ایسی بلندی ایسی پستی'' ۱۹۴۷ میں تخلیق کیا۔ اس ناول میں حیدرآباد کی اعلیٰ سوسائٹی اور جاگیر دارانہ طبقہ میں مشرقی اور مغربی تہذیب کی تصادم کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' ایک خاندان کی سرگزشت ہے جو کبھی جاگیر داری سے متعلق تھا۔ اس خاندان کے افراد ہر وقت اپنی عزت اور کھوئے ہوئے وقار کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو کبھی پوری ہونے والی نہیں ہے۔ اس ناول میں نچلے اور متوسط طبقے کی تہذیب جا بجا جھلکتی ہے۔ اس ناول میں معاشرے کی صورت حال کا نقشہ پیش کیا گیا ہے کہ لوگ ظاہری طور پر دیکھنے میں، بہت بلند معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے اخلاق و عادات اور خانگی حالات اتنے گئے گزرے ہیں کہ ناول نگار نے انہیں پستی سے تعبیر کیا ہے۔ اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس کے سارے رُخ بیانیہ کی تکنیک میں پیش کئے گئے ہیں اور حالات کرداروں کے ذریعے سے قاری کے ذہن نشین کرائے گئے ہیں۔ کرداروں کی نفسیاتی فکر اور فلسفیانہ تہوں کو کھولنے کے لئے عزیز احمد خود کلامی کی تکنیک کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ خود کلامی کے لہجے میں ایک جگہ کہتا ہے—

''مسٹر سریندر تمھارے اس سیاہ رنگ، بندر نما لمبوترے جبڑے اور
پیلے دانتوں پر کون لڑکی عاشق ہوئی، عاشق ہمیشہ تم ہی ہوتے رہے۔'' ۳

''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں عزیز احمد نے جب جس تکنیک کی ضرورت محسوس کی اس کا استعمال اتنی ہی ہنرمندی سے کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔ اس ناول کے آخر میں داخلی خود کلامی وجودیت کے فلسفہ پر مبنی ہے۔ عزیز احمد نے شعور کی رو کی تکنیک اور آزاد تلازمہ خیال کی تکنیک سے کام لے کر زندگی اور وقت کی ہیئت پر جس طرح آج کا ذہن سوچتا ہے اور غور کرتا ہے اسے بے عینہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''شکست'' کا پلاٹ بالکل سیدھا سادہ ہے۔ کہیں کہیں کہانی میں جھول نظر آتا ہے۔ بظاہر واقعات کی ترتیب و تنظیم اور دو کہانیوں کے متوازن ایک ساتھ چلنے کی وجہ سے قاری کو بے ربطی نظر آتی ہے۔ مگر جب ہم گہرائی سے اس ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دو متوازی کہانیوں کے الگ الگ چلتے رہنے کے باوجود ان میں جو ربط ہے وہ ہے پوری سماجی صورت حال، عہد کے سیاسی و سماجی نظام و اقدار اور سماجی جبر کو جو دونوں کہانیوں میں قائم رہتا ہے۔ کرشن چندر اپنے بنیادی اشتراکی نقطۂ نظر کی بنا پر ہی دونوں قصوں کو پیش کرتے ہیں اور اشتراکی فکر ہی دونوں میں ربط برقرار رکھتی ہے۔ کردار ہر طرح کے سیاسی و سماجی جبر اور اس نظام سے خود کو بچانے کے لئے فطرت کی آغوش کا سہارا لیتے ہیں۔ جیسے کہ شیام ہر چیز سے اوب کر فطرت کی رنگینیوں میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔ اس کا یہ فرار دراصل ذات سے فرار نہیں بلکہ اس نظام سے تحفظ پانے کا وسیلہ ہے۔ کرشن چندر نے ''شکست'' میں جگہ جگہ خود کلامی کے ذریعہ شیام کے ذہنی کرب اور جذباتی کشمکش، باغیانہ کیفیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کرشن چندر نے الفاظ کے انتخاب میں بھی کافی احتیاط سے کام لیا ہے۔ لفظوں پر مکمل قدرت، تکنیک پر عبور ہے۔ لہٰذا سیاسی، سماجی شعور اور مناظر کو پینٹ کرنے پر مکمل دسترس سے ہی شکست اپنی منفرد اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

عصمت چغتائی ایک ایسی فکشن نگار ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں کی بنیاد ایک اہم نظریے اور تصور پر رکھی۔ وہ ترقی پسند نظریے کو وسیع اور دورس نگاہ سے دیکھنے کی قائل ہیں۔ ان کے یہاں ترقی پسندی کا مفہوم حد درجہ وسیع ہے۔ انھوں نے ترقی پسندی کا رشتہ سماج کی اولین ضروریات سے جوڑ دیا جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ضرورتوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ ضرورتوں کے اضافے میں ہر انسان اپنے حصے کے ساتھ اور بھی بہت کچھ حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ جس میں دوسروں کے حقوق کی تلافی ہوتی ہے پھر احتجاج اپنے قدم بڑھانے لگتی ہے۔ صورت حال تبدیل ہونے سے نہ تو انسان کے مسائل ختم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ہر انسان آسودگی حاصل کر سکتا ہے۔

متوسط طبقے کی محرومی، ناکامی، بیکاری عصمت کے ہاتھوں ڈھل کر کہیں ناول، ناولٹ تو کہیں افسانہ، ناٹک اور خاکہ کے روپ میں نظر آتی ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے مخصوص لب ولہجہ اور تکنیک سے اپنی ابتدائی تحریروں سے ہی قاری کو چونکا دیا اور سب نے محسوس کیا کہ ادبی دنیا میں ایک نئے فنکار کا ورود ہوا ہے، جس کے پاس کہنے کو کچھ نئی باتیں ہیں۔ عصمت چغتائی نے کئی ناول لکھے جن کے نام ''ضدی''، ''ٹیڑھی لکیر''، ''معصومہ''، ''رسوائی''، ''سودائی''، ''عجیب آدمی'' اور ''دل کی دنیا'' قابل ذکر ہیں۔ ''ضدی'' کا شمار ان کی اولین تخلیقات میں ہوتا ہے۔ جس کی اہمیت عصمت کے اوّل ناولٹ ہونے سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کے ناولوں میں سب سے اہم ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ہے۔ یہ ناول سوانحی انداز کا ہے۔ اس میں ایک کردار کا مطالعہ بچپن سے لے کر جوانی تک اس تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اردو ناول نگاری میں آپ اپنی مثال ہے۔ بنیادی طور پر ''ٹیڑھی لکیر'' خود ان کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔

کہانی بیان کرنے کے بہت سے طریقے رائج رہے ہیں۔ ان میں ایک طریقہ کہانی کو صیغہ واحد متکلم غائب (Third Person) میں بیان کرنا قرار پایا۔ یہ تکنیک دیگر تکنیک سے اس لئے مستحسن سمجھی گئی ہے جس میں بیان کنندہ (Narrator) کرداروں کی زندگی اور ان کے خارجی و داخلی کوائف کے بیان میں حد درجہ غیر جانب داری کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ یہ بات چنداں بتانے کی ضرورت نہیں کہ جب تک ہم کرداروں سے غیر وابستگی کا اظہار نہ کر دیں تب تک ہم اس کردار سے انصاف نہیں کر سکیں گے۔ عصمت چغتائی کی ''ٹیڑھی لکیر'' ان کے دیگر ناولوں میں اس لئے ممتاز ہے کہ اس میں انھوں نے زبان، محاورے اور تکنیک کی سطح پر اپنی انفرادیت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اس ناول کا سنجیدہ مطالعہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ اس کی کہانی بیان کرنے میں عصمت نے صیغہ واحد متکلم غائب کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً ناول کا آغاز ہی اس کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے—

''وہ پیدا ہی بے موقع ہوئی..... نو بچوں کے بعد ایک کا اضافہ جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم سے آگے بڑھ گئی اور دس بج گئے..... حد ہو گئی تھی..... بہن بھائی پھر بہن بھائی۔ بس معلوم ہوتا ہے بھیک منگوں نے گھر دیکھ امڈے چلے آتے ہیں ویسے ہی کیا کم موجود تھے جو اور پے در پے آ رہے تھے..... دو ایک بھائی بہنوں نے تو ذرا چاؤ چونچلے کئے۔ پر اب بڑی آپا کا بھی جی بھر چکا تھا اور وہ بھی بیزار تھیں۔ خیر انا موجود تھی اور وہ پل رہی تھی'' ۴

یہی وجہ ہے کہ ناول کا مرکزی کردار شمن اپنے تمام حسن و قبح اور تمام کمزوریوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ ناول کے بسیط و عریض کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ اور یہی وہ تکنیک ہے جس کی وجہ سے یہ ناول آپ بیتی سے جگ بیتی بن گیا ہے۔

عصمت کے یہاں محاورے، لہجہ اور روزمرہ کا حد درجہ تخلیقی استعمال ملتا ہے اور یہی

ان کے اسلوب کی امتیازی شان ہے۔عصمت کے ناول میں مکالموں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔وہ مکالموں سے کرداروں کی تعمیر کرتی ہیں۔واقعات کو آگے بڑھاتی ہیں اور شخصیت کی نفسیاتی پیچیدگیوں کے گوشے وا کر دیتی ہیں۔کرداروں کی زبان سے ادا کرایا گیا ایک ایک جملہ اس کے اندرون و بیرون ہر تصویر کو اجاگر کرتا ہے۔مکالموں کی چستی، بے ساختگی اور کرداروں کی مناسبت سے ادا کی گئی اس کی زبان ہی تحریر کو حسن بخشتی ہے اور عصمت کی فنی ہنرمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے——

”ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام چھپ کر آہی گئی۔مگر واقعات نے دوسری ہی کروٹ لے لی۔شاعر فوراً کھٹک گیا۔کچھ دن سے پروفیسر بڑے۔وقت ضروری باتیں کرنے آنے لگے۔وہ غریب کوئی اور تحفہ نہیں دے سکتا تھا۔یہ تو گیتوں کی مالا ہی اپنی دیوی کے چرنوں پر چڑھادی، مگر سبھی ایرے غیرے نتھو خیرے رومانی بننے لگے تو یہ تو زیادتی ہے۔ بھنّاتا ہوا آیا۔تھوڑی دیر تو خاموش ضبط کئے بیٹھی رہی پھر جل اٹھی۔“

عصمت نے اوّل تو تشبیہوں کا استعمال کم کیا ہے مگر جہاں بھی وہ نظر آئی ہیں بے انتہا فطری اور خوبصورت ہیں۔عصمت نے ان تشبیہوں کے ذریعہ کرداروں کے خدوخال کی عکاسی کی ہے یا کسی شخصیت کی تفہیم میں یہ تشبیہات معاون بنتی ہیں یا پھر کسی کردار کی زندگی ایک تشبیہ میں ہی نظر آتی ہے۔اور یہی عصمت کا کمال اور ان کی فنی ہنرمندی کی دلیل ہے۔تشبیہوں کے چند نمونے دیکھیے——

۱۔”اس کی باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے رونق تھیں جیسے چپٹی تھالی میں دو مینڈک رکھے ہوں۔“ (ٹیڑھی لکیر،ص ۵۸)

۲۔”وہ پھن کچلے ہوئے سانپ کی طرح بھنّا جاتی۔“(ٹیڑھی لکیر،ص ۸۱)

۳۔جوانی لہراتے پھنکارتے سانپ کی طرح پلک جھپکتے دوڑ گئی۔کچھ یونہی دھندلی سی لکیر باقی تھی۔“(ٹیڑھی لکیر،ص ۲۰۹)

۴۔ نجمہ گرم اور نرم ایسی کے ہاتھوں میں لے کر زور سے دباؤ تو ابلے ہوئے انڈے کی طرح پھسل جائے۔“(ٹیڑھی لکیر،ص ۹۱)

اس طرح ناول ”ٹیڑھی لکیر“ زبان اور بیان کی سطح پر انتہائی اہم ناول بن جاتا ہے جس کی تکنیک ہی اس کے موضوع کا ایک اہم حصہ ہے یا یوں کہیں کہ بغیر زبان اور اسلوب کی ان خوبیوں کے ناول اپنے موضوع کے اظہار سے قاصر ہے۔

”ایک چادر میلی سی“ میں بیدی نے پنجاب کے سکھ معاشرے کی سماجی کیفیت بیان کی ہے جس میں کوٹلہ گاؤں کے باشندے تلوکا کی بیوی رانو جو اپنے خاوند کے قتل ہو جانے کے بعد بیوہ ہو گئی تھی۔پھر دیور سے اس کی شادی ہو جانے کا ماجرا بیان کیا ہے۔اس کا دیور منگل جو اس کی بڑی لڑکی ”بڑی“ جس کا نام ماں باپ نے ”بڑی“ رکھ دیا تھا، وہ قریب قریب منگل کی ہم عمر تھی۔رانو کو اس کے ساتھ شادی کرنے میں نہایت پش و پیش میں تھا۔تلوکا کے قتل کے بعد خاندان والوں نے یہ طے کر لیا کہ منگل کو رانو پر چادر ڈال کر اپنی بیوی بنا لینا چاہیے۔منگل جیسا کہ بدمعاش، شرابی جو مسلمان گھرانے کی لڑکی سلامتے سے عشق کرتا ہے اور شادی کے بعد بھی اس سے محبت برقرار رہتی ہے اس کے باوجود ذمہ داریوں کا احساس اسے مکمل طور پر تبدیل کر دیتا ہے۔اور اسے وفادار شوہر اور ذمہ دار باپ بنا دیتا ہے۔

اس ناول میں رانو،تلوکا اور منگل تینوں کے کردار بڑے جاندار اور مکمل ہیں۔بیدی کے فن کا کمال یہ ہے کہ اس نے محدود کینوس پر بڑا اچھا ناول تخلیق کیا عورت مرد کی نفسیات کے گہرے ادراک، معنی خیز جملے، الفاظ اور کہیں کہیں پر اشعار کے استعمال نے اس ناول کو فنی اعتبار سے بلند مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔اس ناول میں معاشرتی اور نفسیاتی کیفیات اجاگر کرنے میں علامتی اور اشاراتی انداز اختیار کیے گئے ہیں۔بیدی مخصوص اشاروں، کنایوں، محاوروں میں اپنی بات کو اس طرح سمجھا دیتے ہیں کہ نہ تو بیانیہ طرز مجروح ہوتا ہے اور نہ ابہام پیدا ہوتا ہے جس کے لئے تشریح کی ضرورت ہو۔یہاں اس اقتباس کو دیکھئے——

”رانو کے حساب سے ”بڑی“ دن بدن اپنی تقدیر کی تاریخ کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔پچھلے ماگھ کی سنکرانت سے رانو کو بڑی کے نہانے کا حساب رکھنا پڑ رہا تھا۔کہیں دو دن بھی اوپر ہو جاتے تو رانو اس سے عجیب طرح کے الٹے سیدھے سوال پوچھنے لگتی۔تیسرے پہر کو تو کہاں تھی؟ پھر ایشراں کے یہاں سے کہاں گئی؟ مندر میں کون کون تھا؟ کیوں تو پروہت سے گورومنتر لینے بیٹھ گئی؟ جانتی بھی ہے یہ منتر تجھے کہا پہنچائے گا؟ بھول گئی باواہری داس کو............؟“ ۵

بیدی کا یہ ناول اگرچہ بیانیہ انداز میں ہے پھر بھی جو لفظ یا فقرے جس کردار کی زبان سے ادا کرائے گئے ہیں اس کردار کے جنس اور حیثیت کا لحاظ خاص طور سے رکھا گیا ہے۔اس لئے زبان کی چاشنی جگہ جگہ پر پھیلی معلوم ہوتی ہے۔اور جہاں پر مصنف کی اپنی ذات کا تعلق ہے اس کا اظہار اس طرح ہوا ہے کہ ہر موقع پر زبان میں فلسفیانہ انداز اور نفسیاتی تہہ داریاں نہایت فنکاری سے عبارت میں جلوہ آرا ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ بیدی کو زبان و بیان پر کتنا عبور ہے اور اعلیٰ پائے کے لوگوں کے فقرے اور جملے ان کے نوک قلم سے بلا تکلف ادا ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔برمحل اردو فارسی کے وہ اشعار جن سے ان کے بیان کی پختگی اور روانی قاری کو محو حیرت میں ڈال دیتی ہے اور پڑھنے والا ان کی بذلہ سنجی اور باریک بینی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بیدی نے اس ناول میں جزئیات نگاری کا بھی کمال دکھایا ہے۔وہ جزئیات کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ایک ایک چیز کی تفصیل اور اس کی باریکیاں بیان کرنے میں مہارت اور وہ بھی پوری خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ۔اسے بیدی کی فنکارانہ قدرت اور مشاہدہ پر غیر معمولی گرفت کا ہی نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اخیر میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ترقی پسند ناول نگاروں نے اسلوب اور تکنیک کی سطح پر جو تخلیقی تجربے کیے وہ بے حد اہم ہیں۔

حواشی

۱۔بیسویں صدی میں اردو ناول، یوسف سرمست، ترقی پسند اردو بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۰،ص ۳۳۲

۲۔آگ، عزیز احمد، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۴۸،ص ۱۹۹

۳۔ایسی بلندی ایسی پستی، عزیز احمد،ص ۱۰۵

۴۔ٹیڑھی لکیر، عصمت چغتائی،ص ۹۔۱۰

۵۔ایک چادر میلی سی، راجندر سنگھ بیدی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۷،ص ۳۰

□□□

اسریٰ بانو

ریسرچ اسکالر، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

7007990114

اقبال مجید کا افسانہ ’’دلِ چارہ گر‘‘ کا تجزیاتی مطالعہ

جدید فکشن نگاروں میں اقبال مجید کا نام محتاج تعارف نہیں ان کا شمار بیسویں صدی کے ان تخلیق کاروں کی صف میں ہوتا ہے جنہوں نے معاصر فکشن کو نئی سمت و رفتار بخشی۔اقبال مجید نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو کے نثری ادب مثلاً افسانہ، ناول، اور ڈرامہ میں بیش بہا اضافہ کیا۔اگر چہ انہوں نے ادب کی دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن ان کو شہرت و مقبولیت بہ حیثیت افسانہ نگار حاصل ہوئی۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ایک ایسے دور میں کیا جب ایک طرف ترقی پسند تحریک کا اثر ماند ہو چکا تھا اور دوسری طرف جدیدیت کی تحریک طلوع ہو رہی تھی۔نتیجتاً جہاں ان کے ذہن پر ہمیں ترقی پسند تحریک کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔تو وہیں دوسری جانب ان کے فکر و فن پر جدیدیت کا رنگ غالب ہے۔ایک عمدہ تخلیق کار وہ ہے جو اپنی تخلیق میں انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور بیشک اقبال مجید ایک غیر معمولی تخلیق کار ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں رومانیت، حقیقت کے ساتھ ساتھ نفسیات کے عنصر کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا۔اب تک ان کے چھ افسانوی مجموعے ’’دو بھیگے ہوئے لوگ ۱۹۷۰ء، ایک حلفیہ بیان ۱۹۸۰ء، شہر بدنصیب ۱۹۹۷ء، تماشا گھر ۲۰۰۳ء، آگ کے پاس بیٹھی عورت ۲۰۱۰ء، اور خاموش مکالمہ شائع ہو چکا ہے۔

اقبال مجید کا افسانہ ’’دلِ چارہ گر‘‘ ایک سادہ بیانیہ افسانہ ہے۔جو ان کے (۱۵) افسانوں کے مجموعہ ’’دو بھیگے ہوئے لوگ‘‘ میں شامل ہے۔اقبال مجید کا یہ افسانوی مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۷۰ء میں نصرت پبلیشر لکھنؤ سے شائع ہوا۔اس افسانے کا مرکزی کردار مختار میاں ہے افسانے کا پلاٹ اس کے ارد گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔افسانے کی ابتداء میں مختار میاں کا تعارف اقبال مجید نے کچھ اس انداز میں کرایا کہ قاری کے اندر اس کردار کو جاننے کا تجسس بنا رہے۔

’’ذاکر منزل کی ڈیوڑھی پر جب مختار میاں نے آواز لگائی تو اندر عورتوں میں کُھسر پُھسر ہونے لگی‘‘۔

(ص۔۱۷، افسانوی مجموعہ دو بھیگے ہوئے لوگ)

مختار میاں ایک سیدھے سادے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن غریبی اور مفلسی کے سبب چوری کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ہاتھ میں صفائی اس قدر پیدا ہو گئی کہ جہاں جاتے ہیں وہاں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور چرا لیتے ہیں۔جب وہ اپنی والدہ سے ملاقات کرنے اپنے رشتہ دار کے گھر جاتے ہے تو وہاں بھی اپنا ہاتھ صاف کر دیتے ہیں۔

> ’’مختار میاں نے تیزی کے ساتھ ایک بار سارے کمرے کا جائزہ لیا۔سامنے دیوار پر ایک کھلی ہوئی الماری تھی؟ اس میں بجلی کا ٹیبل لیمپ اور ایک مراد آبادی ٹفن کریر رکھا تھا۔مختار میاں نے ان دونوں چیزوں کو جلدی سے اٹھایا اور پھرتی کے ساتھ ڈیوڑھی پار کر کے دروازے کے پاس آئے اور گردن نکال کر آہستہ سے سیٹی بجائی باہر اندھیرے سے ایک آدمی نکلا، مختار میاں نے اسے وہ دونوں چیزیں تھما دیں اور وہ پھر اندھیرے میں غائب ہو گیا‘‘

(ص۔۷۵، افسانوی مجموعہ دو بھیگے ہوئے لوگ)

ان کی ماں اپنے گھر کی مفلسی اور بیٹے کے چوری کے کارناموں سے تنگ آ کر اپنا گھر چھوڑ کر اپنی بیٹی فاطمہ کے ہمراہ اپنے بھانجے حیدر صاحب کے گھر رہنے پر مجبور ہے۔اگر چہ اس افسانے میں مختار میاں کا کردار ایک آوارہ اور چور اچکے کا ہے۔

> ’’اقبال مجید نے مختار میاں کے اس جملے کے ذریعے نہ صرف ایک بھائی کی بہن کے لئے فکر کو پیش کیا ہے بلکہ ذات پات اور نسل پرستی کی اس دقیانوسی سوچ پر بھی طنز کیا ہے جس کے تحت ایک سید گھرانے کی لڑکی کی شادی سید قوم کے لڑکے سے ہی ہوگی۔مختار میاں اپنی بہن کی زندگی کے تعلق سے فکر مند اور پریشان ہو جاتا ہے۔وہ یہ نہیں چاہتا کہ جس قرب سے وہ گزرتا ہے اسی سے اس کی بہن بی گزرے اس کے اسی پیشے کی وجہ سے اس کی ماں اور بہن دونوں رشتے داروں کے بیچ میں ذلیل و خوار ہوتی ہیں۔مختار اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ شبو ایک سید زادہ تو ضرور ہے مگر اسی کی طرح چور بھی ہے۔جو دوسرے کو لوٹنے کا کام کرتا ہے۔وہ جب اپنی بہن کی خوشی کے لئے شبو کو اس دھندے سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو شبو کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے ایک دن ہمت کر کے وہ اپنے استاد (مختار میاں) سے یہ پوچھ ہی لیتا ہے کہ وہ اس کو نظر انداز کیوں کر رہا ہے۔‘‘

لیکن اسکے اندر ایک ذمہ دار بھائی کا دل بھی موجود ہے جو اپنی بہن کی فکر کرتا ہے۔اقبال مجید نے اس افسانے میں ایک بھائی کی ذمہ داری کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا۔بھائی خواہ چور، اچکا، لٹیرا ہی کیوں نہ ہو والد کے بعد وہ اپنی بن کا محافظ ہوتا ہے۔جب اسے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس کی بہن فاطمہ اس کے چیلے شبو سے محبت کرتی ہے تو وہ اس کی فکر میں حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ جب اس پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اسکی اماں کو ان دونوں (شبو اور فاطمہ) کے رشتے سے کوئی دقت نہیں تو وہ بیزار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔

''وہ تو بس ایک ہی بات جانتی ہیں کہ لڑکا سید ہو قوم کا کھرا چاہے جواری ہو بدکار ہو کچھ بھی''۔

(ص۔۷۷،افسانوی مجموعہ دوبھیگے ہوئے لوگ)

اقبال مجید نے مختار میاں کے اس جملے کے ذریعے نہ صرف ایک بھائی کی بہن کے لئے فکر کو پیش کیا ہے بلکہ ذات پات اور نسل پرستی کی اس دقیانوسی سوچ پر بھی طنز کیا ہے جس کے تحت ایک سید گھرانے کی لڑکی کی شادی سید قوم کے لڑکے سے ہی ہوگی۔مختار میاں اپنی بہن کی زندگی کے تعلق سے فکرمند اور پریشان ہو جاتا ہے۔وہ یہ نہیں چاہتا کہ جس کرب سے وہ گزرتا ہے اسی سے اس کی بہن بھی گزرے اس کے اسی پیشے کی وجہ سے اس کی ماں اور بہن دونوں رشتے داروں کے بیچ میں ذلیل و خوار ہوتی ہیں۔مختار اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ شبو ایک سید زادہ تو ضرور ہے مگر اسی کی طرح چور بھی ہے۔جو دوسرے کو لوٹنے کا کام کرتا ہے۔وہ جب اپنی بہن کی خوشی کے لئے شبو کو اس دھندے سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو شبو کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے ایک دن ہمت کر کے وہ اپنے استاد (مختار میاں) سے یہ پوچھ ہی لیتا ہے کہ وہ اس کو نظر انداز کیوں کر رہا ہے۔تب وہ بتاتا ہے کہ وہ اس کو اِس دھندے سے الگ کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ شرافت کی زندگی بسر کر سکے۔وہ شبو کو بتاتا ہے کہ مجھے تمہارے اور فاطمہ کے رشتے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔اب مختار میاں شبو کو فاطمہ کے ساتھ زندگی گزارنے اور دادا گیری کی علامت قرولی میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنے کو کہتا ہے۔

''شبو جی میں کچھ کہونگا اسے ٹھنڈے دل سے سنو گے کیوں نہیں؟
تم جانتے ہو شبو کہ میں نے مشکل سے مشکل بات کو ایک منٹ سے زیادہ نہیں سوچا مگر اب میں خاموش رہتا ہوں۔جی ہاں استاد شبو سیدھی بات یہ ہے کہ میں تم کو اس دنیا سے ہٹا دینا چاہتا ہوں جس میں تم اب تک میرے ساتھ رہے ہو۔میں چاہتا ہوں تم شریفوں کی سی زندگی گزارو۔''

(ص۔۹۵،دوبھیگے ہوئے لوگ افسانوی مجموعہ)

یہ سن کر شبو شرمندہ ہو کر زار و قطار رونے لگتا ہے اور مختار میاں سے کہتا ہیں کہ۔

''شبو کی شادی قرولی سے ہو چکی ہے''۔

(ص۔۹۵،افسانوی مجموعہ دوبھیگے ہوئے لوگ)

یہیں پر افسانہ اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔افسانہ مختصر ضرور ہے لیکن قاری کی توجہ کو مرکوز کیے ہوئے ہے۔جس سے افسانے کو پڑھنے میں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔مصنف نے اپنے اس افسانے میں مناظر کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

''جاڑے کی رات تھی، محلے کی تنگ و تاریک گلیاں ٹھٹھری ہوئی تھیں اور نکڑ پر لگی ہوئی لالٹین کی لو کانپ رہی تھی اور ہر طرف گہرا کہرا پھیلا ہوا تھا۔گھروں کے دروازے بند تھے۔''

(ص۔۷۱،افسانوی مجموعہ دوبھیگے ہوئے لوگ)

مناظر کے علاوہ افسانے کے مکالمے افسانے کی دلچسپی میں مزید اضافہ کرتے ہیں کرداروں کے مقابل ہونے والے مکالمات کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ ساری باتیں ہمارے سامنے ہی ہو رہی ہیں۔مصنف نے کرداروں کی شخصیت کی مناسبت سے ان کے مکالمے لکھے ہے۔مثلاً تقی جو شبو کو ذلیل کرنے کا موقع کبھی نہیں جانے دیتا وہ مختار کے شبو کو رات میں چوری کرنے والے گروہ میں شامل نہ کرنے پر اس پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''کیوں بے رانڈ کے سانڈ، تیری قرولی میں کیا زنگ لگ گیا ہے۔تو کیوں چپ بیٹھا ہے۔''

(ص۔۸۵،افسانوی مجموعہ دوبھیگے ہوئے لوگ)

اس مکالمے کو پڑھنے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ تقی کے دل میں شبو کے لئے کتنی نفرت بھری ہے۔اقبال مجید نے اپنے اس افسانے میں کردار نگاری کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔مختار میاں، بی اماں، فاطمہ، شبو کے کردار کو اس افسانے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ان کے علاوہ دیگر چھوٹے کرداروں میں حیدر صاحب، حنیف، رحمت، قاسم، تقی، بھگو داس، منشی جی وغیرہ ہے۔ان تمام کرداروں کی اپنی الگ شناخت ہے وہ تھوڑی ہی دیر کے لیے افسانے میں آتے ہیں لیکن ان کا وجود پورے افسانے میں محسوس ہوتا ہے، ہر کردار اپنے کردار میں باعمل نظر آتا ہے۔مصنف نے مختار میاں کے کردار کو جس انداز میں پیش کیا وہ قابل توجہ ہے۔ایک ایسا شخص جو افسانے کی ابتدا میں اپنی والدہ سے زور زبردستی کر اس کے بچے کھچے پیسے بھی اس سے لے لیتا ہے افسانے کے اختتام تک وہیں بے مروتی مختار میاں بہن کی محبت میں شبو جو کہ اس دھندے میں اس کا دایاں ہاتھ ہی اس کو خود سے اور اس چوری کے پیشے سے دور کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔

اقبال مجید نے اس افسانے کے ذریعے چوری، گنڈہ گردی کے پیشے سے منسلک لوگوں کی نفسیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔مختار میاں اپنی غربت کے سبب چوری کرنے پر مجبور ہے۔وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ اس پیشے سے وابستہ لوگوں کی زندگی بہت تلخ اور مصیبتوں سے بھری پڑی ہے۔ان کے احساس و جذبات کی قدر اس معاشرے میں کسی کو نہیں۔اس کے ساتھ ہی ان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے احساس و جذبات کے مسائل کو بھی اس افسانے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہے۔افسانے کا قاری ابتدا میں جس مختار میاں کو منفی کردار سمجھتا ہے افسانے کے اختتام پر اسی مختار میاں کے لئے اس کے دل میں مثبت احساس جنم لے لیتے ہیں۔

❑❑❑

التماس

''ماہنامہ نیا دور'' کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوز شدہ، مکمل ایڈریس، موبائیل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ--

غزل

غم کو میرے ساتھ سہو تو بہتر ہے
نسخے اپنے پاس رکھو تو بہتر ہے

آپ کو تو معلوم ہے کتنا نازک ہے
شعر ہمارا آپ پڑھو تو بہتر ہے

جگنو ہاتھ جلا کر بھی اُڑ سکتا ہے
پر تم خود آزاد کرو تو بہتر ہے

مانا ہمکو یار فلک تک جانا ہے
لیکن پاؤں زمیں پے ہو تو بہتر ہے

میرے نالے پے تم رو بھی سکتے ہو
پر اس دُھن پر جھوم سکو تو بہتر ہے

چھوڑ رہی ہو، اچھا ہے، آباد رہو
ساتھ رہو، برباد رہو، تو بہتر ہے

عشق۔وِشق سب نوسکھیوں کی باتیں ہیں
رامؔ سماجی شعر لکھو تو بہتر ہے

رام کمار
راگوکھل، ویسٹ ایچ پی ایس او، سیکٹر 122 موہالی
8427473129

غزل

عشق پروان یوں چڑھا ہی نہیں
در ملاقات کا کھلا ہی نہیں

یوں زمانے پہ جھوٹ غالب ہے
سچ یہاں کوئی بولتا ہی نہیں

جس طرف دیکھنا ضروری ہے
اُس طرف کوئی دیکھتا ہی نہیں

حق بیانی کرے گا کیا کوئی
لب کشائی کا حوصلہ ہی نہیں

ہے بھلا اپنا ہی بھلائی میں
اس طرح کوئی سوچتا ہی نہیں

اس سے امید غم گساری کی
جو کسی غم سے آشنا ہی نہیں

جس کا نایابؔ کوئی حل نہ ہو
ایسا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں

سلیم نایابؔ فیروزآبادی
نایاب منزل، شریف آباد اسٹریٹ، رام گڑھ روڈ، فیروزآباد
0961974176

غزل

وہ ماں کا لاڈلا اپنے کو البیلا سمجھتا ہے
سگے سے بڑھ کے ہوں اس کا جو سوتیلا سمجھتا ہے

یہ دنیا اچھے اچھوں کی سمجھ میں آ نہیں پاتی
سو کوئی خاک داں اس کو کوئی میلا سمجھتا ہے

مری منزل سے واقف ہیں اگرچہ خواہشیں میری
مگر افراد کی ہر بات کب ریلا سمجھتا ہے

انڈیلے جا رہا زہر میرے آب گینے میں
مجھے وہ مہرباں سقراط کا چیلا سمجھتا ہے

مہکتی ہے جب اس کے ذکر سے انگنائی تو اس کو
کوئی جوہی سمجھتا ہے کوئی بیلا سمجھتا ہے

عمارت میں کوئی خوبی نظر آتی نہیں جس کو
وہ اس پتھر کو بھی تو آنکھ کا ڈھیلا سمجھتا ہے

پرکھتا ہے مری قیمت مرے سامان سے راحتؔ
ٹھکانے سے لگا دیتا ہے جب ٹھیلا سمجھتا ہے

راحت حسن
اولڈ ناز ریزیڈنسی، سرسید نگر، علی گڑھ
9997198963

غزل

ایک خاموش ، کوئی نغمہ ہے
جس نے دل کو مرے چُھوا سا ہے

یہ حقیقیت ہے تلخ سی لیکن
اس جہاں کا چلن نہ بدلا ہے

کس قدر ہے حسین وہ لمحہ
جب کوئی ساتھ میرے ہوتا ہے

بات کڑوی لگی ہے جو تم کو
سچ پہ مبنی یہ ایک مصرع ہے

شاعری میری سب کی سب ، پیارے
تیری چاہت ہی کا قصیدہ ہے

دفن ہوگا کبھی نہیں کوئی
یوں مری روح میں وہ زندہ ہے

ایک مدت کے بعد پھر ، انجم
درد ، الفت کا جاگ اٹھا ہے

فریدہ انجم
ترنی پرساد لین، چھوٹی مسجد، پٹنہ
8235851828

اکمل نعیم صدیقی

جی-سیکٹر، پرتاپ نگر، جودھپور-راجستھان

9413844624

میرا گھر کہاں ہے؟

والد صاحب ہم دونوں بھائی بہنوں سے بہت محبت کیا کرتے تھے۔خصوصاً انہیں مجھ سے زیادہ لگاؤ تھا۔اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں کیونکہ باپ کا جھکاؤ ہمیشہ بیٹیوں کی طرف اور بیٹیوں کی توجہ بھی باپ کی جانب زیادہ ہوا کرتی ہے۔بھائی سرفراز ہمیشہ سے ماں کا لاڈلا تھا۔پڑھائی کا بے حد شوق ہونے کی وجہ سے میں ہر کلاس میں ہمیشہ اول رہتی آئی ہوں۔اب میرا گریجویشن مکمل ہونے کو تھا۔مجھے گھر کے کاموں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔یہ بات والدہ کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔وہ کہا کرتی تھیں" کہ اگلے گھر جا کر چولہا چوکا بھی تو سنبھالنا پڑے گا۔یہ کام نہیں سیکھوگی تو کیسے چلے گا۔سسرال میں جا کر ہماری ناک کٹاؤ گی۔

جب میں ان کی شکایت والد سے کرتی تو وہ بھی والدہ کی تائید کرتے ہوئے کہتے" بیٹا،تمہاری ماں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔مجھے نہیں جانا سسرال وسرال۔میں ناراضگی کے ساتھ کہتی۔

سب لڑکیاں یہی کہتی ہیں شازیہ بیٹا۔مگر لڑکی کا اصلی گھر اس کی سسرال ہی ہوتا ہے۔" وہ بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے تو کیا یہ گھر میرا نہیں ہے؟ تو پھر یہ گھر سرفراز کا کیوں ہے؟ مجھے ہی کیوں ایک انجانے گھر کے لئے تیار کیا جارہا ہے؟"کئی سوال میرے ذہن میں اچانک کوندھنے لگتے۔اور جب یہ سوال میں اپنے والدین سے کرتی تو بس ایک ہی جواب ملتا؛ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں"۔یہی زمانے کی ریت ہے بیٹا۔کس نے بنائی یہ ریت؟ کاش مجھے مل جائے، پوچھوں گی ضرور اس سے۔مگر مجھے کوئی نہ ملا جو میرے سوالوں کے جواب دیتا۔میں نے اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد جاب کرنے کی بات کہی تو والدین کی طرف سے اجازت نہیں ملی۔ان کا متفقہ طور پر کہنا تھا کہ اب اس بات کا فیصلہ میرا ہونے والا شوہر کرے گا۔والدین میری شادی کو لے کر بہت فکرمند تھے۔وہ اس انسان کی تلاش میں شدت سے سرگرداں تھے جو آنے والے وقت میں،میری زندگی کی کمان اپنے ہاتھ میں لے گا۔جو یہ طے کرے گا کہ میرا مستقبل کیسا ہوگا۔میں جاب کروں گی یا نہیں۔اور ہاں کس کا گھر میرا گھر ہوگا۔

ادریس سے میری شادی ہوئے آٹھ سال کا عرصہ ہوگیا۔والدین اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ادریس نے مجھے وہ ساری خوشیاں دیں جن کے بارے میں ایک لڑکی اپنے لڑکپن سے سوچا کرتی ہے۔میری اور ادریس کی زندگی ارمان ہے۔وہ ابھی محض تین سال کا ہے۔ مجھے اب لگنے لگا تھا کہ ابو اور امی صحیح کہتے تھے۔ادریس کا گھر ہی میرا گھر ہے۔ایک شام ادریس کے آفس سے فون کال آیا جس نے میری دنیا ہی بدل ڈالی۔ادریس کو آفس میں سائلنٹ اٹیک آیا اور موقع پر ہی ان کی موت واقع ہوگئی۔ادریس مجھ سے جدا ہو گئے،بنا کچھ کہے،بنا کچھ سنے،چپ چاپ۔۔۔۔

ادریس کے جانے کے بعد،وہ گھر جسے میں اپنا سمجھنے لگی تھی اچانک میرے لئے پرایا سا ہوگیا۔تمام اہل خانہ کا رویہ میرے لئے اچانک تبدیل ہوگیا۔دیگر لوگوں کے ساتھ ساس بھی مجھ سے خفا خفا رہنے لگی۔اسے نہ جانے کیوں ایسا لگتا تھا کہ ان کے بیٹے کی موت کی ذمہ دار میں ہوں۔دیور اور جیٹھ کی نظر جائداد پر تھی۔انہوں نے مجھے طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ان کے مظالم جب بے برداشت ہونے لگے تو مجھے یاد آیا کہ میرا ایک گھر اور ہے،میرے اپنے بھائی سرفراز کا گھر۔وہ میری ایک کال پر مجھے لینے آگیا۔

والدین اب اس دنیا میں نہیں تھے۔گھر میں صرف بھائی اور بھابھی تھے۔یہ گھر بھائی اور بھابھی نے بڑے شوق سے بنوایا تھا۔اس گھر کی تعمیر کے دوران جب بھی کبھی پیسے کی ضرورت پڑی تو بھابھی کے گھر والوں نے بھی تعاون کیا۔ورنہ اتنا عالی شان گھر بنانا بھائی کے بس کی بات نہیں تھی۔والد صاحب نے تو کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔وہ تمام عمر کرائے کے مکان میں ہی رہے۔

بھائی کے گھر آ کر مجھے کچھ سکون کا احساس ہوا۔بھائی اور بھابھی میرا بہت خیال رکھتے تھے۔مگر ارمان کچھ پریشان رہتا تھا۔وہ مجھ سے بار بار پوچھتا کہ" امی ہم اپنے گھر کب چلیں گے ؟" میں اسے سمجھاتی تھی کہ اب یہی ہمارا گھر ہے۔

چھ مہینے گزر گئے۔ارمان اب ساڑھے تین سال کا ہو گیا تھا۔میں نے اسے قریب کے ایک اسکول میں داخل کر دیا تھا۔مجھے بھی ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب مل گئی تھی۔بھائی کے کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے وہ ارمان سے بہت محبت کرتے تھے۔ارمان بھی ان سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔زندگی کی گاڑی دھیرے دھیرے پٹری پر آ رہی تھی۔

میں مطمئن تھی کہ میں اور ننھا ارمان کم سے کم بے گھر نہیں ہیں۔میرے بھائی کا گھر میرا ہی گھر ہے۔مگر ایک شام جب میں کچن سے اپنے کمرے کی طرف لوٹ رہی تھی تو میں نے بھائی کے کمرے سے بھابھی کی آواز سنی۔وہ قدرے تلخ لہجے میں بھائی سے مخاطب تھی:

آخر شازیہ کب تک یوں ہمارے گھر میں رہے گی ؟

مجھے لگا جیسے کسی نے میرے قدموں تلے زمین کھینچ لی ہو۔اچانک ہی میرا توازن بگڑا اور میں دیوار کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہو گئی۔میری آنکھوں کے آگے دھواں سا لہرانے لگا،کانوں سے عجیب سی سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں،دل ڈوبنے لگا۔میں جیسے تیسے اپنے کمرے تک پہونچی اور دھم سے بستر پر دراز ہو گئی۔میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔

کچھ دنوں کی کوششوں کے بعد مجھے پڑوس کی ہی ایک کالونی میں کرائے پر گھر مل گیا اور میں وہاں شفٹ ہو گئی۔بھائی نے بہت چاہا کہ میں انہیں کے ساتھ رہوں مگر میں نے انہیں سمجھایا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔بھائی تو روزانہ ہی شام کو ارمان سے ملنے میرے گھر آتے،اتوار کے دن بھابھی بھی آجاتی تھیں۔جب کبھی میری چھٹیاں ہوتیں تو میں ان کے گھر چلی جاتی۔مجھے بھائی اور بھابھی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔بلکہ یہ میری غلطی تھی کہ میں بھائی کے گھر کو اپنا گھر سمجھ بیٹھی تھی۔

وقت پنکھ لگا کر اڑتا رہا۔ارمان نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دئے تھے۔بھائی کی سفارش پر اسے ایک کمپنی میں نوکری بھی مل گئی تھی۔

اپنی تنخواہ سے بچت کر کے میں نے شہر کی ایک اچھی کالونی میں پلاٹ لے لیا تھا جس پر ارمان نے بینک سے لون لے کر گھر تعمیر کر لیا۔بیٹے کے ساتھ میں اپنے گھر میں بہت آرام اور اطمینان کی زندگی گزار رہی تھی۔

ارمان کو صفیہ پسند تھی۔میں نے بھائی سے جب اس کا ذکر کیا تو اس نے بھی ارمان کی پسند پر اپنی مہر لگا دی۔صفیہ بہو بن کر میرے گھر آ گئی۔میں نے کبھی اسے اپنی بہو نہیں مانا بلکہ اسے اپنی بیٹی ہی سمجھا۔ارمان کی شادی کو تین سال گزر گئے مگر گھر میں جب کوئی کلکاری نہیں گونجی تو مجھے فکر ہوئی۔میں نے ارمان کے بجائے صفیہ سے اس بارے میں بات کرنا مناسب سمجھا۔

دیکھو صفیہ بیٹی،میری عمر کا اب کوئی بھروسہ نہیں ہے۔کیا تم نہیں چاہتیں کہ میں اس دنیا سے وداع ہونے سے پہلے اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ کچھ وقت گزار سکوں ؟"

ممی جی،ارمان اور میں ابھی سے بچوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتے۔" صفیہ نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

جھنجھٹ ؟ تم نعمت کو جھنجھٹ سے تعبیر کر رہی ہو ؟ تعجب ہے ؟ کیا تم نے سرفراز ماموں اور ممانی کو نہیں دیکھا ہے؟ ایک بار عمر نکل جانے کے بعد کوکھ سونی ہی رہ جاتی ہے صفیہ۔" میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا الٹا وہ مجھ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی۔میں جب بھی اس موضوع پر بات کرتی،وہ بات کا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کرتی یا اٹھ کر چلی جاتی۔کبھی کبھی اس کا لہجہ ترش ہو جاتا اور وہ مجھ سے بے مطلب کی باتوں پر الجھنے لگتی۔ایسے مواقع پر میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتی تھی۔

وقت جیسے اپنا کام کر رہا تھا۔آج میرے اور صفیہ کے درمیان پھر کھٹ پٹ ہو گئی۔وہی نوک جھونک جو نہ چاہتے ہوئے بھی اس رشتے کے مقدر میں نہ جانے کیوں لکھ دی گئی ہے۔میں جانتی تھی کہ اس سب کا اثر ارمان پر ہوتا ہے۔وہ ماں اور بیوی کے درمیان پھنس کر رہ جاتا ہے۔

اسے ماں بہت عزیز ہے اور وہ بیوی سے بھی محبت کرتا ہے۔میں عموماً خاموشی اختیار کر لیتی ہوں لیکن کبھی کبھی خاموش رہنا بھی غلط ہوتا ہے۔اور میں ایسے وقت میں چپ نہیں رہتی۔آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔شام کو جب ارمان آفس سے لوٹا تو گھر کا ماحول ٹھیک نہیں تھا۔

گھر کی لابی میں تینوں موجود ہیں۔میں،ارمان اور صفیہ۔ارمان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا" آپ دونوں ایک بات غور سے سن لیجئے،یہ روز روز کے جھگڑے میرا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔میں اپنی نوکری اور کام پر دھیان دوں یا آپ دونوں کے جھگڑے نمٹاؤں۔اگر آپ لوگوں کو میرے گھر میں رہنا ہے تو یہ سب بند کرنا پڑے گا۔

میرے گھر میں۔۔۔،ارمان نے ایسا کیوں کہا ؟

کیا یہ جملہ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ؟ کیا یہ مردوں کی فطرت ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ گھر کے مالک وہی ہو سکتے ہیں۔

تو کیا یہ گھر میرا نہیں ہے۔۔۔میں غلط فہمی میں جی رہی تھی ؟

تو میرا گھر کہاں ہے۔۔۔؟

شازیہ کو ایسا لگا مانو کسی نے پگھلا ہوا گرم سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ارمان کے یہ الفاظ اس کے کانوں سے ہوتے ہوئے اس کے دل و دماغ تک پہنچے۔اس کے دماغ میں ایک زوردار دھماکہ سا ہوا۔دل میں درد کی ایک تیز لہر سی دوڑی اور وہ بے سدھ ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔

ارمان نے بہت آہستگی سے شازیہ کو قبر میں اتارا۔اس کے چہرے کو قبلہ رخ کیا اور باہر نکل آیا۔قبر کو پتھر کی سلیوں سے بند کر دیا گیا۔جنازے میں شامل لوگوں نے قل کی مٹی ڈالنی شروع کی۔پھر پھاولے سے ایک شخص نے مٹی کا ڈھیر لگا کر قبر کو شکل دی۔مولانا نے آخری بار میت کی مغفرت کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔شازیہ مٹی کے ڈھیر کے نیچے اپنے گھر میں آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔اپنے ابدی گھر میں۔

❑❑❑

فیروز عالم جلالپوری

محلہ قاضی پورہ، پوسٹ آفس جلال پور، ضلع امبیڈکر نگر

9936560128

اپنا اپنا گریبان

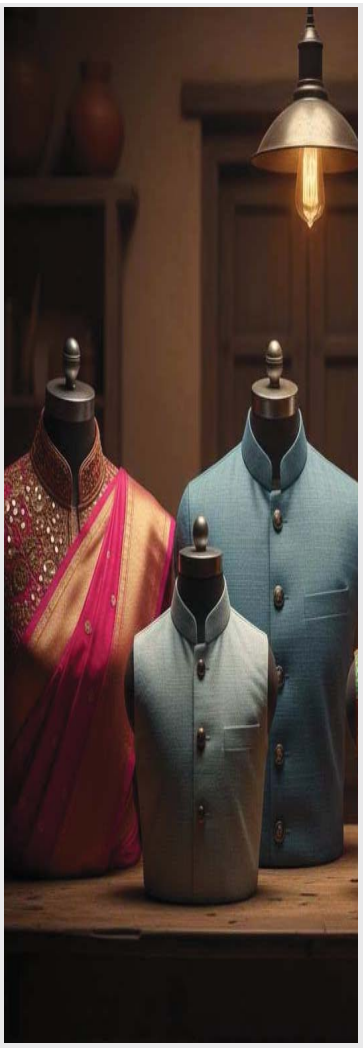

شہر کی اور گاؤں، قصبے کی زندگیوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ شہر کا معاشرہ اور گاؤں، قصبے کا معاشرہ الگ الگ قسم کا ہوتا ہے۔ شہر میں اگر کوئی برا کام کرے تو وہاں کا معاشرہ زیادہ توجہ نہیں دیتا، جبکہ اگر گاؤں، قصبے میں کوئی برا کام کرے تو فوراً معاشرہ ایکشن میں آجاتا ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے معاشرہ متنفر ہو جائے اور ہم ناقدریٔ معاشرہ کا شکار ہو جائیں۔ عزیزہ بیگم یہی بات اپنے شوہر عادل صاحب کو سمجھانے کی کوششیں کر رہی تھیں مگر عادل صاحب تھے کہ جیسے عزیزہ بیگم کی بات سننے کو ہی راضی نہ تھے۔

تقریباً چھ ماہ قبل عادل صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ تقریباً بیس سالوں سے اپنے قصبے سے سو کلو میٹر کی دوری پر واقع ایک بڑے شہر میں نہ صرف یہ کہ اسکول ٹیچر کی نوکری کر رہے تھے، بلکہ وہیں اپنے والدین اور بیٹی، بیٹے کے ساتھ ایک کرائے مکان میں سکونت پذیر بھی تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا دل نواز اور اکلوتی بیٹی امروز شہر کے ایک کالج میں زیر تعلیم تھے۔ مگر پچھلے چھ ماہ قبل جب ان کا ریٹائرمنٹ ہوا تو وہ اپنے والدین، بیوی عزیزہ بیگم اور بیٹی امروز کے ساتھ اپنے آبائی قصبے میں آکر پشتینی مکان میں شفٹ ہو گئے۔ بیٹا دل نواز شہر ہی میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ بیٹی امروز کو آگے کی تعلیم کے لئے قصبے کے ایک کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ یہ کالج عادل صاحب کی رہائش گاہ سے تقریباً پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک غیر آباد اور سنسان علاقے میں تھا۔ وہاں لڑکے، لڑکیاں سائیکل یا بائیک سے جایا کرتے تھے کیونکہ وہاں تک بس یا آٹو رکشہ وغیرہ کبھی کبھی ہی جاتے تھے۔ اسی لئے داخلہ کے بعد امروز نے ایک اسکوٹی لینے کی ضد اپنے والد سے شروع کر دی۔ یہ بات عزیزہ بیگم کو منظور نہیں تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ گاڑی یا اسکوٹی شہروں میں لڑکیاں ضرور چلاتی ہیں مگر قصبوں اور گاؤں میں اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ معاشرہ اسے قبول نہیں کرے گا۔ اسے ایک برا کام تصور کیا جائے گا اور اس کے عوض میں معاشرہ ہمیں سزا کا مستحق قرار دے گا۔ لہٰذا اسکوٹی لینا ہمارے لئے صحیح نہیں مگر عادل صاحب، عزیزہ بیگم کی باتوں سے بالکل متفق نہیں تھے۔ وہ عزیزہ بیگم کی باتوں کو نظر انداز کر کے اپنی بیٹی امروز کی بات کو صحیح قرار دے رہے تھے۔ اور پھر عادل صاحب نے وہی کیا جو ان کی بیٹی امروز چاہتی تھی۔ گھر میں ایک نئی اسکوٹی آگئی۔

اور پھر جب امروز اسکوٹی سے کالج جانے لگی تو جیسے پورے محلے میں کہرام برپا ہو گیا۔ حالانکہ امروز حجاب پہن کر سلیقے سے اسکوٹی چلاتی تھی مگر پھر بھی محلے والوں کو یہ منظور نہیں تھا۔ پورے محلے کے لوگ بے حد خفا ہو گئے۔ راستے میں، گلیوں میں، چائے دوکانوں اور چوراہوں پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ عورتیں گھر کے اندر عادل صاحب کے خلاف کانا پھوسی کرنے لگیں۔ اور پھر یوں ہوا کہ عادل صاحب جب محلے کی مسجد میں نماز ادا کرنے جاتے یا نماز ادا کر کے واپس اپنے گھر کی جانب آتے تو راستے میں لوگ انہیں طنزیہ جملے سناتے کوئی کہتا کہ۔۔۔۔ یہ شہر والی منمانی یہاں نہیں چلے گی کوئی کہتا کہ۔۔۔۔۔ یہ شہر نہیں قصبہ ہے۔ اسے شہر بنانے کی کوشش برداشت نہیں کی جائے گی کوئی کہتا کہ۔۔۔۔ شہروں سے سیکھ کے آئے ہیں۔ اب برائی یہاں بھی پھیلائیں گے وغیرہ۔۔ وغیرہ

عادل صاحب کا جی چاہ رہا تھا کہ پلٹ کر جواب دیں مگر وہ جواب نہیں دے رہے تھے۔ کیونکہ وہ پڑھے لکھے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنے کا مطلب بے عزتی اور رسوائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یا یوں کہیں کہ عادل صاحب جانتے تھے کہ یہ لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں، یہ اپنے بے سر پیر کے جواز سے چند منٹ میں ہی ان کے عالمانہ جواز کی دھجیاں اڑا کر ان کی بولتی

بند کر دیں گے۔ یہ سچ ہے کہ ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کی طاقت کو کبھی کم تر نہیں سمجھنا چاہیے۔ خاص طور سے جب وہ غول بنا کر بیٹھے ہوں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ مخلص اور تعلیم یافتہ انسان ریگستان کی نرم اور ٹھنڈی ریت پر چلنے والوں کی مانند ہوتا ہے جنکے پاؤں کی کوئی آواز نہیں ہوتی، لیکن جنکے پاؤں کے نشانات ریت پر ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ اسی لئے وہ امید کے جگنو کو اپنے اندر زندہ رکھتے ہوئے بالکل خاموشی اختیار کر کے مسجد جاتے اور نماز پڑھ کر واپس گھر آجاتے۔ عادل صاحب کو پورا یقین تھا کہ اندھیرا کتنا ہی گہرا اور مضبوط ہو روشنی کی ایک ہلکی سی کرن سے ہار جاتا ہے۔ ایسے ہی دو تین دن گزر گئے اور پھر ایک صبح جب عادل صاحب اپنے گھر کے بیرونی کمرے میں بیٹھے چائے پینے کے ساتھ اخبار دیکھ رہے تھے تو انہیں سامنے سڑک پر تین لوگ اپنی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ ان تینوں لوگوں کو عادل صاحب بخوبی جانتے پہچانتے تھے۔ ان میں ایک محلے کی مسجد کے امام مولانا اکبر صاحب تھے۔ دوسرے قصبے کے معروف ایڈوکیٹ زاہد صاحب تھے اور تیسرے محلے کے سب سے دولت مند تاجر سیٹھ ابرار صاحب تھے۔ یہ تینوں لوگ عادل صاحب کے ہم عصر تھے۔ عادل صاحب بچپن میں ان تینوں لوگوں کے ساتھ اٹھے بیٹھے اور کھیلے تھے۔ تینوں لوگ عادل صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے اور علیک سلیک کے بعد سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ عادل صاحب نے گھر کے اندر سے ان لوگوں کے لئے چائے منگوائیں اور خیر خیریت لینے کے بعد آنے کی وجہ دریافت کی تو سب سے پہلے مولانا اکبر صاحب گویا ہوئے۔

عادل صاحب! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ کئی سال پہلے محلے کے ہم چند لوگوں نے مل کر اصلاح معاشرہ نامی ایک تنظیم قائم کی تھی، جو آج تک اپنے کام کو بحسن وخوبی انجام دے رہی ہے۔ محلے کے بہت سارے افراد اس کے ممبر ہیں۔ میں حقیر اس کا صدر، ایڈوکیٹ زاہد صاحب نائب صدر اور محترم الحاج سیٹھ ابرار صاحب اس کے سرپرست ہیں اتنا کہہ کر مولانا اکبر صاحب خاموش ہو تو ایڈوکیٹ زاہد صاحب نے بولنا شروع کیا۔

عادل صاحب! ہماری یہ تنظیم، بیحد کامیاب تنظیم ہے۔ اس تنظیم کے ذریعے ہم نے معاشرہ کی بہت ساری برائیوں اور لعنتوں کو نیست ونابود کر دیا۔ اس کے علاوہ ہم معاشرے کی بہت ساری برائیوں اور لعنتوں کو ختم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں اور اسی سلسلے میں ہم آج آپ سے ایک شکایت کرنے آئے ہیں، وہ یہ کہ آپکی بیٹی آجکل اسکوٹی سے کالج جارہی ہے۔ ایک جوان لڑکی کا اسکوٹی چلا کے کالج جانا یا کالج سے آنا ہمارے معاشرے کے لئے شرمناک ہے۔ اگر آپ کی بیٹی کو دیکھ کر کے محلے کی دوسری لڑکیاں اسکوٹی چلانے لگیں تو بتائیے معاشرے کا کیا ہوگا ایڈوکیٹ زاہد صاحب یہ سوال کر کے رکے تو سیٹھ ابرار صاحب بھی بولے بغیر نہ رہ سکے۔

اس لئے عادل صاحب! ہم آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ اپنی بیٹی کو اسکوٹی چلانے سے روکیں ورنہ ہماری تنظیم آپ کے خلاف سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے گی سیٹھ ابرار صاحب کے لہجے میں دھمکی کی آمیزش صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں آپ کی اور آپ کی تنظیم اصلاح معاشرہ کی بے حد عزت کرتا ہوں معززین! عادل صاحب اصلاح معاشرہ تنظیم کے تینوں عہدیداران کی باتوں کو سننے کے بعد مدھم آواز میں بولے۔ دنیا کے ہر معاشرے میں اصلاح معاشرہ کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے اور دیا بھی جانا چاہیے۔ لیکن۔۔۔۔ لیکن کسی بہ پردہ لڑکی کے اسکوٹی چلانے سے معاشرہ پر برا اثر پڑے گا، یہ بات میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آپ سب لوگ پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ میں نے بھی تھوڑی سی تعلیم حاصل کی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ تھوڑا سا میں نے بھی کیا ہے۔ بہت پہلے جب مشینیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں اور لوگ گھوڑے، اونٹ وغیرہ سے سفر کیا کرتے تھے، اس زمانے میں مرد گھوڑے یا اونٹ کی سواری تو کرتے ہی تھے، عورتیں اور لڑکیاں بھی حجاب پہن کر گھوڑے، اونٹ کی سواری کیا کرتی تھیں اور یہ کام بڑے بڑے صوفی، ولی، بزرگ اور دانشور کے دور میں ہوا ہے۔ جب اس دور میں کسی صوفی، ولی، بزرگ اور دانشور نے بہ حجاب عورتوں اور لڑکیوں کو گھوڑے یا اونٹ کی سواری سے نہیں روکا تو آپ لوگ اس دور میں ایک بہ حجاب لڑکی کو اسکوٹی کی سواری سے کیسے روک سکتے ہیں؟

عادل صاحب کے اس مدلل جواب سے اصلاح معاشرہ کے تینوں عہدیدار بالکل ہکا بکا رہ گئے، ان کے چہروں پر مایوسیوں کی لکیریں نمودار ہوگئیں، کہتے ہیں بات ہمیشہ تمیز سے اور اعتراض ہمیشہ دلیل سے کرنا چاہیے۔ اگر بات میں تمیز اور اعتراض میں دلیل نہ ہو تو خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ اصلاح معاشرہ کے تینوں عہدیداروں نے بھی عادل صاحب کے جواب پر خاموشی سے سر جھکا لیا۔ فوراً ہی عادل صاحب نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ کا رنگ بکھیر کر بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

چل چھوڑ اس بات کو۔ آپ لوگ تو میرے بچپن کے دوست ہو۔ آپ لوگوں کے ساتھ میں، میں نے اپنا بچپن اور جوانی اسی محلے میں گزارا ہے۔ مجھے بیحد خوشی ہو رہی ہے کہ آپ لوگ مجھ سے ملنے میرے غریب خانہ پر آئے اور میرا حال مجھ سے جانا۔ اب تھوڑا سا میں بھی آپ لوگوں کا حال جاننا چاہوں گا۔ تو بتائیے مولانا اکبر صاحب!۔۔۔ کیا حال ہے آپ کا؟ عادل صاحب مولانا اکبر صاحب سے مخاطب ہوا بھی ایک سال پہلے میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کے نوجوان بیٹے جاوید کو کسی کمسن لڑکی سے زنا بالجبر کرنے کے جرم میں پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ اخبار میں مزید لکھا تھا کہ جس وقت پولیس نے جاوید کو گرفتار کیا تھا وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ کیا ہوا اس کا؟ کیا وہ قانون کی گرفت سے آزاد ہوا؟ عادل صاحب کے سوال پر مولانا اکبر صاحب جیسے سکتے میں آگئے۔ ان کی زبان جیسے لکنت زدہ سی ہو گئی۔

جی۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ عادل صاحب!۔۔۔ ابھی وہ۔۔۔ جیل ہی میں ہے۔ کوششیں جاری ہیں۔ ہو سکتا ہے جلد ہی اس کی ضمانت ہو جائے اور مسٹر وکیل صاحب عادل صاحب اب ایڈوکیٹ زاہد صاحب کی طرف متوجہ ہوئے آپ نے تو وکالت میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ دو سال پہلے میں نے سنا تھا کہ آپکی بہو نے آپ کے اور آپ کے ساتھ آپکی بیوی، بیٹی اور بیٹے کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تھا کہ آپ لوگ اپنی بہو کو جہیز کم لانے کے لئے بڑی اذیتیں دیتے ہیں۔ کیا اس کیس سے بری ہوئے آپ لوگ عادل صاحب کے اس سوال پر ایڈوکیٹ زاہد صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ پھر بڑی کوشش کر کے تھوک نگلتے ہوئے بولے۔

اب کیا بتاؤں عادل صاحب! معاملہ کورٹ میں زیر غور ہے۔ تاریخیں پڑ رہی ہیں۔ ہم صلح کرنا چاہتے ہیں مگر لڑکی والے مانتے ہی نہیں۔ دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے ایڈوکیٹ زاہد صاحب کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح رندھے ہوئے گلے سے اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

اور اب آپ بتائیں سیٹھ ابرار صاحب عادل صاحب نے سیٹھ ابرار صاحب پر نظریں جما کر کہا آپ نے تو ماشاءاللہ بہت ترقی کر لی ہے۔ سیکڑوں پاور لوم کے مالک ہیں آپ۔ قصبے کے رئیسوں میں شمار ہوتا ہے آپ کا لیکن آپ کے دو بھائی اکرم اور عمران، جو آپ سے چھوٹے ہیں، وہ آپ سے کافی ناراض ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ نے دو سال پہلے گھر

اور کاروبار کے بٹوارے میں ان کی حق تلفی کی ہے۔تمام زیورات، روپئے، پیسے اور دوسری پراپرٹیز میں آدھا خود لے لیا اور آدھے میں سے آدھا آدھا دونوں بھائیوں کو دے دیا۔آپ کے والدین بھی آپ سے ناراض ہیں وہ آپ کے دونوں بھائیوں کی ناراضگی کو جائز قرار دے رہے ہیں اور انہیں کے ساتھ رہ کر اپنی ضعیفی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ یہ ساری باتیں لمحۂ فکریہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ بہتان ہے عادل صاحب سیٹھ ابرار صاحب، عادل صاحب کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑے میرے بھائیوں کی میرے اوپر الزام تراشی ہے۔ دراصل میرے دونوں بھائی نہایت ہی ناکارہ اور کام چور ہیں جسکی انہیں سزا مل رہی ہے۔ میں تو عادل صاحب بہت بڑی آزمائش کے دور سے گزر رہا ہوں۔سچ یہ ہے کہ میں نے دن رات محنت کی اور اپنے دماغ کا بہتر استعمال کر کے سب کچھ حاصل کیا۔اس کے عوض اگر میں نے بٹوارے میں کچھ زیادہ بھی لے لیا تو کون سی بے ایمانی کی۔ بتائیے عادل صاحب اب آپ نے بے ایمانی کی یا نہیں کی، یہ تو پانچ پنچ کے درمیان اس موضوع پر گفتگو کر کے ہی پتہ چل سکتا ہے۔ دوسری بات، معاشرے میں زیادہ تر انسان ایسے ہوتے ہیں، جو اپنی تکلیف کو آزمائش کا نام دیتے ہیں اور دوسروں کی تکلیف کو ان کے گناہوں کی سزا مانتے ہیں۔سیٹھ ابرار صاحب کے خاموش ہونے کے بعد عادل صاحب تلخ لہجے میں بولے۔سیٹھ صاحب! ایک کامیاب انسان کی کامیابی کے پیچھے سیکڑوں لوگوں کی محنتیں شامل ہوتی ہیں، جن کو اکثر وہ بھول جاتا ہے۔اسے لگتا ہے کہ اس کی کامیابی صرف اس کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ یہی تکبر ایک دن اس کے عروج کو زوال میں تبدیل کر دیتا ہے۔ایک بات سمجھ لیجئے ابرار صاحب! آپ اپنے بھائیوں اور والدین کو پوری طرح مطمئن کر کے ہی معاشرے میں سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔اس لیے میں کہتا ہوں کہ اصلاح معاشرہ بے حد اہم چیز ہے۔میرے والد صاحب اصلاح معاشرہ کے بہت بڑے حمایتی ہیں۔بیس سال پہلے جب میری نوکری شہر میں لگی تھی اور میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ شہر میں رہائش پذیر ہوا تھا تو میرے والد صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا! جو تربیت میں نے تمہیں دی ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔" میں آج تک اپنے والد کی تربیت کے زیر اثر زندگی گزار رہا ہوں۔میرے والد صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ! اصلاح ہمیشہ اپنے گھر یعنی خود کی ذات سے شروع کرو۔مولانا صاحب! ایڈوکیٹ صاحب اور سیٹھ صاحب! میری آپ تینوں سے گزارش ہے کہ آپ تینوں کے ساتھ ساتھ تنظیم کے تمام ممبران، بلکہ محلے کے تمام لوگ بھی اگر صحیح اصلاح معاشرہ کی تشکیل چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے گھر سے، اپنی ذات سے اصلاح کرنے کی مہم شروع کیجئے پھر دیکھئے آپ لوگوں کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ارے آئینوں پر الزام دینے سے بہتر ہے کہ اپنے چہروں پر پڑے ہوئے گرد و غبار صاف کی جائیں۔

عادل صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے اور پھر انہوں نے ان تینوں اصلاح معاشرہ کے عہدیداران کی طرف دیکھا، جن کے چہروں پر رسوائی، پشیمانی اور شرمندگی کی ایسی پرچھائیاں جھلک رہی تھیں کہ جن پر چھائیوں سے دور رہنے کی انسان خدا سے زندگی بھر دعائیں مانگتا ہے۔

❑❑❑

غزل

یاد اُس کی بہت ستاتی ہے
زندگی موت بنتی جاتی ہے
عشق ہے اک غریب کی بیٹی
رات دن ذلتیں اٹھاتی ہے
ماں سے کم تو نہیں ہے یہ محنت
چین سے رات کو سلاتی ہے
عشق کیا ہو گیا ہے پھر مجھ کو
تیری ہر بات مجھ کو بھاتی ہے
موت ہنستی ہے ہر گھڑی لیکن
اشک یہ زندگی بہاتی ہے
کتنی کرتی ہے پیار کی باتیں
کتنا پاگل تجھے بناتی ہے
یہ شکایت ہے زندگانی سے
صرف نوحہ ہی کیوں سناتی ہے
ایک قولِ محال ہے تری یاد
رنج کے ساتھ خوشیاں لاتی ہے
سانس گھٹتی ہے موت کی مقصودؔ
جو مجھے ہر گھڑی بلاتی ہے

مقصود خاں علیگ
اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی
8595687815

نورین فیض آبادی

اے ڈی اے کالونی فہیم آباد، کانپور

7388516454

برسات کی دیوی

بہت پرانی بات ہے ایک گاؤں میں کھانے پینے کی چیزوں کا فقدان پڑ گیا تھا۔ گاؤں والے اپنی ضروریات کا سامان دور گاؤں سے خرید کر لایا کرتے تھے۔

گاؤں میں ہر سال برسات کے مہینے میں خوب جم کر پانی برستا تھا اس کے باوجود بھی گاؤں میں کھیتی کسانی کا اکال پڑا ہوا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ گاؤں سے دور ایک اونچی پہاڑی تھی جہاں ایک دیوی رہتی تھی۔ وہ سال بھر خوش وخرم رہتی تھی مگر جب برسات کی پہلی بوندیں زمین پر پڑنا شروع ہوتی تھیں وہ زاروقطار رونے لگتی تھی خدا جانے اس کا برسات کے پانی سے کیا تعلق تھا جو وہ رونے لگتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ گاؤں میں برسات ہونے کے بعد بھی کوئی کھیتی کسانی نہیں کرتا تھا۔

اس دیوی کو گاؤں والے ایک عذاب تصور کرتے تھے وہ دیوی سے فریاد کرنے پہاڑی پر اکثر وبیشتر جایا کرتے تھے۔ وہ رو رو کر فریاد کرتے اسے بتاتے کہ ہمارے کھیت اور کھلیان بیکار ہو رہے ہیں، ہم کھانے پینے کی اشیاء دور گاؤں سے خرید کر لانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو ہم بھوکے مر جائیں گے، اے دیوی تم برسات کے موسم میں رونا چھوڑ دو۔ دیوی ان کی باتیں سن تو لیتی تھی مگر کوئی جواب نہیں دیتی تھی ایسے ہی کئی سال گزر گئے مگر دیوی نے رونا نہیں چھوڑا۔ گاؤں والے رفتہ رفتہ بھکمری کے دہانے پر آ گئے۔

ایک دن شہر سے اس گاؤں میں سلیم نام کا لڑکا آتا ہے جو ان سب باتوں سے بے خبر تھا اس کو جب پتہ چلتا ہے کہ گاؤں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ کھانے خریدنے کیلئے روپئے پیسے کا اکال پڑا ہوا ہے تو وہ کچھ پریشان ہوتا ہے۔ گاؤں والوں نے جب اسے اپنی روداد سنائی تو وہ کشمکش میں پڑ گیا۔ اس نے سوچا کیا واقعی ایک دیوی کے رونے سے برسات کے پانی کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے؟ وہ دیوی کون ہے؟ کوئی احساس ہے، بھوت، جن، جنات، آسیب وغیرہ۔

وہ اگلے دن اس پہاڑی پر جانے کا ارادہ کرتا ہے، گاؤں والے اسے اس پہاڑی پر جاتا ہوا دیکھ کر دعا گو ہو جاتے ہیں، سلیم اپنے کندھے پر ایک تھیلا لٹکائے ہوئے جس میں کچھ ضروریات کے سامان کے علاوہ بانسری بھی تھی، پہاڑی کی طرف دھیرے دھیرے بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ سلیم کو لڑکپن سے بانسری کو ساتھ رکھنے اور اسے بجانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ جب کبھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا تھا تو بانسری بجاتا تھا، بانسری اس کی دوست، اس کی ساتھی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر میں اسی پہاڑی پر پہنچ جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے پہاڑی پر ایک عجیب سا کرب پھیلا ہوا ہے۔

اس کرب میں اندھیرا، تنہائی، بے رونقی شامل ہے۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اِدھر اُدھر اپنی نظریں دوڑاتا ہوا پورا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ ایک غار پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے ہو نہ ہو یہ غار ہی اس دیوی کی آرام گاہ ہے، جہاں وہ رہتی ہے۔ وہ غار کے پاس پڑے ہوئے ایک چوڑے پتھر پر بیٹھ کر اپنی تھکن اتارنے لگتا ہے، کچھ دیر راحت کی سانس لینے کے بعد وہ تھیلے سے بانسری نکالتا ہے اور بجانا شروع کر دیتا ہے۔

بانسری کی تان سن کر وہ دیوی اس سے سرہانے آ کر بیٹھ جاتی ہے، سلیم کو ایک عجب سا احساس ہوتا ہے، وہ بانسری بجانا بند کر دیتا ہے تو دیوی اس سے پوچھتی ہے تم کون ہو، یہاں کیا کر رہے ہو؟

سلیم سہم کر کہتا ہے میں اس گاؤں کا رہنے والا ایک لڑکا ہوں جو کسی ضرورت کے تحت شہر چلا گیا تھا آج میں کافی عرصے کے بعد اپنے گاؤں واپس لوٹا ہوں تو گاؤں کی حالت دیکھ کر میں بہت پریشان ہوا اور گاؤں والوں نے مجھے آپ کے بارے میں تفصیل سے بتایا بس آپ سے ملنے کے ارادہ سے میں یہاں آ گیا ہوں۔

دیوی سلیم کی بات سن کر مسکرائی اور کہنے لگی کہ تم نے بانسری کہاں سے بجانا سیکھی، سلیم نے اس سے بتایا کہ بانسری میری زندگی کی سب سے حسین دوست اور ساتھی ہے۔ جب کبھی میں اپنے آپ کو تنہا تصور کرتا ہوں تو بانسری بجانے لگتا ہوں، یہ بانسری لڑکپن سے میرے ساتھ ہے، دیوی اس کی باتیں سن کر زور سے قہقہہ لگاتی ہے پھر ایک دم خاموش ہو کر پوچھتی ہے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

سلیم کہتا ہے کہ میں آپ کے رونے کا سبب جاننا چاہتا ہوں، دیوی اس کے سامنے اصل وجود میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ سلیم اسے دیکھ کر سکتہ میں پڑ جاتا ہے۔ دیوی اسے بتاتی ہے کہ تم پہلے آدمی ہو جس نے میری آواز کو سنا اور مجھے دیکھا ہے۔ میں برسات کی دیوی ہوں، میرا نام پھول من ہے، میرا ٹھکانہ آسمان ہے، میں وہیں کی رہنے والی ہوں۔ سلیم پھول من کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا، وہ آگے کہتی ہے کہ میرا ایک محبوب تھا جس کا نام دلاور تھا، وہ مجھ پر اپنی جان نثار کرتا تھا، ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور اکثر گاہے بگاہے ملا بھی کرتے تھے۔

پتہ نہیں کیسے ہمارے عشق کی خبر پھیل گئی، میری بڑی بہن جس کا نام نادیدہ تھا وہ دلاور سے انجانے میں پیار کرتی تھی، دلاور تو اس سے کبھی ملا بھی نہیں تھا، وہ اسے دور سے آتے جاتے دیکھتی رہتی تھی، اسے جب ہم دونوں کے عشق کی خبر ہوئی تو وہ مجھ سے بہت ناراض ہو گئی، اس نے دیوتاؤں سے میری شکایت کی، دیوتاؤں کی عدالت میں مجھے پیش کیا گیا اور دیوتاؤں نے مجھے آسمان سے زمین پر پھینکنے کی اجازت دیدی۔ اس دن سے میں اس غار میں بند ہوں، میری سزا میرا عشق ہے، اب جب برسات کا موسم آتا ہے تو مجھے میرا محبوب یاد آتا ہے جس کے کہنے پر میں بے وقت بارش کر دیتی تھی، اس کی جدائی ہی میری آنکھوں میں آنسو پروتی ہے، یہی سبب ہے جو میں برسات کے موسم میں رونے لگتی ہوں۔

سلیم اس کی باتیں سن کر روہاسا ہو جاتا ہے وہ دیوی کی طرف دیکھ کر کہتا ہے کہ اب تم رونا چھوڑ دو، ممکن ہے تمہارے اس عمل سے دیوتا خوش ہو جائیں۔ دیوتا کیا گاؤں والوں کے دن بھی پھر جائیں گے وہ بدحالی سے خوش حالی کی طرف لوٹ جائیں اور تمہیں دل سے دعائیں دیں گے۔ ہوسکتا ہے یہ دعائیں تمہاری سزا کو کم کر دے۔ تمہاری سزا کو مٹا دے۔ دیوی اس کی بات سن کر وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب پھر کبھی نہیں روئے گی۔

□□□

غزل

کلید علم سلیقے سے جو لگے گی نہیں
خرد جو قفل زدہ ہے کبھی کھلے گی نہیں

اِک اور ظلم اسے بھی سمجھ کے جی لیں گے
بہت جو تیز ہوا ہے تو کیا رکے گی نہیں

وہ عشق کیا ہے جو اجداد سے جُدا کر دے
حیات چل تو گئی ہے مگر چلے گی نہیں

اِک آئینہ ہے جو دیکھے گا وہ دکھائے گا
ہزار اصل چھپا لو مگر چھپے گی نہیں

کتاب پڑھنے پڑھانے سے عقل بڑھتی ہے
جُنون پراش کھلانے سے تو بڑھے گی نہیں

جلا تو لی ہے محبت کی آگ سینے میں
یہ ایسی آگ ہے جو حشر تک بُجھے گی نہیں

ہم آ گئے ہیں، ابھی اور آئیں گے تابشؔ
صلیب و دار کی رونق کبھی گھٹے گی نہیں

ایم ایچ تابش رُدولوی
محلہ۔پورہ بساونپوسٹ،ردولی،ضلع،ایودھیا
9580228003

اُجالا پروین

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

9234454893

ایک ماں ایسی بھی

گاؤں میں دو شادیاں تھیں۔ ہر طرف خوشی کا ماحول تھا۔ دونوں گھروں کو نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ چمکدار لڑیاں جو گھر کی دیواروں پر سجی تھیں وہ ہر راہ چلنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ بعض لوگ تو یہ سوچ کر حیران تھے کہ آخر دونوں گھروں کو ایک ساتھ کیوں سجا دیا گیا ہے؟ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے نہایت خوش نظر آرہے تھے، وہ خوشی میں ادھر ادھر پھدکتے تو کبھی پٹاخے پھوڑتے اور کبھی خوب شور کرتے۔ گاؤں کے بزرگوں کی زبان پر ایک ہی دعا ہوتی اللہ ان کو ہمیشہ خوش رکھے، ان کا گھر آباد ہو۔ دراصل روہی اور جوہی بہت اچھی دوست تھیں۔ ان کا بچپن ساتھ ہی گزرا اور سن بلوغت کی دہلیز پر بھی ساتھ ہی قدم رکھا۔ اسکول سے لے کر کالج تک کا زمانہ انہوں نے ساتھ ہی طے کیا۔ جب باقی سہیلیوں کے ساتھ کبھی شادی کا ذکر چھڑ جاتا تو بہت شرماتیں اور کہتیں کہ ہماری شادی ایک ہی گاؤں میں ہوگی، اور شادی بھی ہم دونوں کی ایک ہی دن ہوگی۔ اللہ نے بھی ان کی زبان سے نکلی اس بات کو قبول کر لیا، اور جب رشتہ آیا تو دونوں کا ایک ہی گاؤں سے آیا اور شادی بھی طے ہوگئی۔

جوہی اور روہی کو دوگنی خوشی تھی۔ ایک تو اپنی شادی کی اور دوسری اس بات کی کہ وہ دونوں جدا نہیں ہوں گی۔ ان کی دوستی یوں ہی برقرار رہے گی۔ کبھی کبھی وہ دونوں آپس میں باتیں کرتیں اور خوب ہنستیں۔ جوہی کہتی: روہی اگر تمہاری ساس نے تمہیں مجھ سے کبھی نہیں ملنے دیا یا تم پر پابندیاں لگائیں تو تم کیا کروگی؟ یہ سنتے ہی روہی بول اٹھتی ارے تم پاگل ہو کیا؟ وہ مجھ پر پابندی کیوں لگائیں گی؟ یا تم سے ملنے کیوں نہیں دیں گی یہ کام تو ان کا بیٹا بھی نہیں کر سکتا، پھر تو وہ ساس ہیں۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں وہ خوب کرتیں اور خوب ہنستیں۔ آج شادی تھی، دونوں کے گھروں میں بارات آئی، اور خوشی خوشی شادی کی تقریب مکمل ہوئی، دونوں اپنے اپنے سسرال کو رخصت ہوئیں اور اپنی شادی شدہ زندگی گزارنے لگیں۔ اس دوران جب وہ میکے جاتیں تو ساتھ جاتیں اور ساتھ مل کر خوب اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرتیں۔

وقت گزرتا چلا گیا اور دونوں کو اللہ نے بیٹیوں سے نوازا۔ اب ان کی خوشی کا کیا ہی کہنا وہ دونوں یہ سوچ کر خوش ہوتیں کہ اب ان کی دوستی صرف ان تک محدود نہیں رہے گی بلکہ ان کی بیٹیاں ان کی دوستی کے سلسلے کو آگے بڑھائیں گی۔ وہ سسرال سے لے کر مائکہ تک اپنی دوستی سے ہی پہچانی جاتیں۔ ان کے سسرال والوں کو بھی ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ہر کوئی انہیں پیار کرتا اور زندگی بھی نہایت ہنسی خوشی کٹ رہی تھی۔ مگر ایک روز جوہی کی ہنستی کھیلتی زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی اور کسی ٹرک حادثے میں اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے ماں باپ بے سہارا ہو گئے، جوہی بیوہ ہوگئی اور اس کی بیٹی جس کا نام روزی تھا اس کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ اب وہ کس کو بابا کہے گی؟ اب وہ اپنی خواہشوں کا اظہار کس سے کرے گی؟ اب اس کے لیے چاکلیٹ کون لے کر آئے گا؟ جب کبھی بابا غصہ کرتے تھے تو وہ ماں کے آنچل میں پناہ لیتی تھی اور جب ماں غصہ کرتی تو باپ کی گود میں خود کو محفوظ محسوس کرتی تھی، مگر اب اسے ماں کے غصے سے کون بچائے گا اور وہ کس سے شکایتیں کرے گی؟

اب تو جوہی کا گھر ہی اجڑ گیا۔ جب تک شوہر زندہ تھا اسے سر کا تاج بنا کر رکھا گیا۔ شوہر کے مرنے کے بعد ساس نے ظلم کرنا شروع کر دیا۔ چند مہینوں تک وہ ساس کے تمام ظلموں کو خندہ پیشانی کے ساتھ سہتی رہی اور شکایت کا ایک حرف بھی ہونٹوں پر نہ آنے دیا مگر جب اس کی بیٹی روزی کو بھی اس کی ساس نے ستانا شروع کر دیا تو اس کے صبر نے بھی جواب دے دیا۔ وہ اپنی تمام شکایتیں لے کر روہی کے پاس جایا کرتی اور اس کے پاس ہی رو کر اپنا جی ہلکا کرتی۔

چند مہینے بعد گاؤں کی دو چار عورتوں نے اس کی ساس کو خوب بہکانا شروع کر دیا۔ وہ کہتیں اب جب تمہارا بیٹا ہی نہیں رہا تو اس کو کیوں رکھا ہوا ہے؟ اسے جلد از جلد نکال باہر کرو گھر سے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جائیداد کی دعویدار بن کر کھڑی ہو جائے۔

وہ ان عورتوں کے بہکاوے میں آ گئی اور اس نے بہو کو پوتی سمیت گھر سے نکال دیا۔ جوہی اپنی بیٹی کے ساتھ مائکے میں رہنے لگی چونکہ اب وہ بیوہ تھی تو بھائیوں نے بھی اسے بوجھ سمجھنا شروع کر دیا۔ بھائیوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ رکھا۔ کبھی کبھی تو انہوں نے یہ بھی احساس دلا دیا کہ وہ ان کے ٹکڑوں پر پل رہی ہے۔ وہ ایک غیرت مند اور باوقار عورت تھی اور ان تمام چیزوں سے بڑھ کر وہ ایک ماں تھی۔ وہ اپنی تکلیفوں کو برداشت تو کر سکتی تھی مگر اپنی اولاد کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس نے اپنے بھائیوں کے رویے سے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، اس کے باپ نے اسے اس کی اجازت نہیں دی مگر وہ صرف اس شرط پر رہنے کے لیے راضی ہوئی کہ اسے ایک کمرہ دے دیا جائے اور کچھ نہیں۔

اس کے والد نے اسے ایک کمرہ عطا کر دیا۔ اب جوہی اپنی بیٹی کے ساتھ اس ایک چھوٹے سے کمرے میں رہنے لگی۔ وہ سلائی بنائی کرتی تو کبھی دوسروں کے کھیتوں میں کام کرتی اور اس سے جو مزدوری حاصل ہوتی اس سے ان دو ماں بیٹیوں کا گزارہ ہوتا۔ بھائیوں کے طعنوں سے آزاد اس کمرے میں اسے نیند بہت اچھی آتی۔ اسی طرح زندگی کا کارواں آگے بڑھتا گیا اور کئی مہینے بیت گئے۔

ایک روز جب وہ صبح اپنے گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ اسے ایک ساتھ بہت سے لوگوں کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ جب اس نے گھر سے باہر قدم رکھا تو دیکھا کہ روہی کے گھر کے آگے بہت بھیڑ ہے اور اس کی امی خوب رو رہی ہیں۔ وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کسی بیماری کے سبب صبح روہی کے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سنتے ہی اس پر بجلی گر پڑی اور اس کی اپنی تمام یادیں تازہ ہو گئیں۔ وہ اپنے گھر آئی اور اس نے خوب آنسو بہائے اور اللہ سے شکایتیں کرنے لگی کہ میں تو دکھوں کے پہاڑ سے دو چار ہو ہی رہی تھی، اس پر بھی آفتوں کا نزول ضروری تھا کیا؟ شادی بھی ایک ساتھ اور بیوگی بھی ایک ساتھ؟ اللہ ہم سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی سزا اس کم عمری میں مل رہی ہے۔

روحی کی بھی ایک بیٹی تھی جس کا نام تمنا تھا۔ اس کے شوہر کی موت کے کچھ وقت بعد ان ماں بیٹیوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا جو جوہی اور اس کی بیٹی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اب روہی بھی اپنے مائکے میں ہی رہنے لگی تھی۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ اور کوئی غم سننے والا نہیں تھا۔ وہ اپنے تمام درد ایک دوسرے کے ساتھ بانٹتی اور خوب رویا کرتی۔ جیسے تیسے مائکے میں بھی ان کی زندگی کٹ ہی رہی تھی کہ پھر ان دونوں کی رشتے کی بات ہونے لگی۔ ان کے والدین ان کی دوبارہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کی دیکھ بھال، ان کی تعلیم، ان کی شادی ہر چیز کے ذمہ داری وہ خود پوری کریں گے بشرطے کہ انہیں دوبارہ اپنی زندگی میں رنگ بھرنا ہوگا۔

روحی اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ خود بھی کبھی کبھی سوچا کرتی کہ اتنی طویل زندگی ہے، اکیلے گزارا کب تک ہوگا؟ وہ مزید سوچتی کہ والدین جب تک زندہ ہیں تب تک تو زندگی اچھے سے کٹے گی مگر جب والدین بھی بوڑھے ہو جائیں گے اور کسی چیز پر ان کا اختیار نہ ہوگا تب میں کیا کروں گی؟ پھر سوچتی بھائی ہیں نا! مگر پھر جوہی کے بھائیوں کی تصویر اس کے سامنے پھر جاتی اور وہ مایوس ہو جاتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی بیٹی تمنا کو اپنے پاؤں کی بیڑی تصور کرتی۔ سوچتی اگر یہ نہ ہوتی تو میں مکمل آزاد ہوتی مگر اس نے میری آزادی میں رکاوٹ لگا دی۔ جب اس نے اپنے والد کی یہ بات سنی کہ تمنا کی پرورش کی ذمہ داری انہوں نے خود لے لی تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہ رہا اور وہ فوراً دوسری شادی کو راضی ہو گئی۔

مگر دوسری طرف جوہی اپنی بیٹی روزی سے بے حد پیار کرتی تھی۔ وہ اسے اپنی زندگی کا واحد سہارا مانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ بغیر ماں باپ کے بچوں کی پرورش کیسے ہوتی ہے۔ سوچتی تھی کہ باپ کے سائے سے تو یہ محروم ہو ہی چکی ہے لیکن میں اپنی آزادی کے لیے، اپنی زندگی سنوارنے کے لیے اس سے ماں کی مامتا بھی اس سے نہیں چھین سکتی۔ جب بھی شادی کی بات ہوتی اسے طرح طرح کے سوالات آ گھیرتے اور وہ شادی کے لیے بار بار انکار کرتی۔ جب اس کے والدین نے اس پر شادی کے لیے دباؤ بنانا شروع کر دیا تو اس نے اپنے والدین کے سامنے ایک شرط رکھ دی کہ وہ شادی تو کرے گی مگر اس شخص سے جو اس کو اس کی بیٹی کے ساتھ قبول کرے۔ اس کی اس شرط نے اس کے والدین کی پریشانی میں اضافہ کر دیا کیونکہ اولاد کے ساتھ کسی لڑکی کو قبول کرنا ہمارے سماج میں بہت غلط تصور کیا جاتا ہے اور اگر شرط ہی یہ ہے تو شادی ہونے سے رہی۔ معاشرے کی ایک خرابی یہ ہے کہ اگر مرد صاحب اولاد ہے اور وہ دوبارہ شادی کرنا چاہے تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر جب ایک عورت اپنی اولاد کے ساتھ ہی رخصت ہونا چاہے تو اسے بہت نامناسب سمجھا جاتا ہے۔

چند دنوں کے بعد روہی کی شادی نہایت سادگی سے کی گئی اور وہ اپنے نئے شوہر کے ساتھ خوشی خوشی رہنے لگی مگر جہاں تک جوہی کی بات تھی وہ اپنی شرط پر قائم رہی۔ ایک روز ایک معجزہ ہوا اور اس کے لیے ایک ایسا رشتہ آیا جس نے اسے اس کی بیٹی کے ساتھ ہی قبول کر لیا۔ وہ روزی کو اپنی سگی اولاد کی طرح ہی پیار کرتا تھا۔ اس کی تمام فرمائشیں پوری کرتا اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال کرتا۔ اس کا داخلہ ایک اچھے اسکول میں کرا دیا گیا اور اس نے اپنی تعلیم کی سیڑھیوں میں دھیرے دھیرے قدم رکھنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف تمنا کے پاس نہ ماں کی محبت تھی اور نہ ہی باپ کی شفقت، نہ بہتر کھانا، نہ لباس، نہ سر پر چھت اور نہ کوئی اپنا۔ گاؤں کی عورتیں اسے بے سہارا سمجھ کر اس سے طرح طرح کے کام کرواتیں۔ انکار کرنے پر اسے پیٹا بھی جاتا۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے کام کیا کرتی جس کے بدلے اسے کھانا دے دیا جاتا۔ اس کے لباس اچھے نہ ہوتے تھے جس کی وجہ سے بچے اس کے ساتھ کھیلا نہیں کرتے۔

جب وہ بچوں کو اپنے والدین کے ساتھ دیکھا کرتی تو دل ہی دل یہ خواہش کرتی کہ کاش! میں بھی اپنے والدین کے ساتھ ہوتی، مجھ سے بھی کوئی پیار کرتا، مجھے بھی اچھے کپڑے ملتے، مجھے بھی اچھا کھانا دیا جاتا، کوئی مجھے مارتا نہیں، کوئی مجھ سے کام نہیں کرواتا۔

جب وہ اپنے ہم عمر بچوں کو اسکول جاتا دیکھتی، کسی کے بچے کو ڈاکٹر بننے، تو کسی کے پولیس بننے، تو کسی کے انجینیئر بننے تو کسی کے ماسٹر بننے کی باتیں سنتی تو خوب رویا کرتی اور سوچتی اگر میری بھی امی ہوتی تو میں بھی ان کی طرح ہی اسکول جایا کرتی، میں بھی ڈاکٹر بنتی، انجینیئر بنتی، ماسٹر بنتی۔

لفظ امی سنتے ہی اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے اور وہ بار بار خود سے سوال کرتی کیا مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں؟

❑❑❑

سہیل کاکوروی
قندھاری لین، لال باغ لکھنؤ
6306705188

تبصرہ

آتماؤں کے سراب

افق ادب پر ابھرنے والے راجیو پرکاش ساحر نے شاعری سے سفرِ ادب کا آغاز کیا ایک مجموعہ بھی لے آئے لیکن ان کو جلد احساس ہو گیا کہ کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لے اور افسانے کو ذریعہ اظہار بنایا جنکی پیہم اشاعت نے حوصلہ بڑھایا اور اس صنف میں انکی کامیابی نے ان میں اعتماد پیدا کیا۔ اور وہ ناول نگاری کی طرف مائل ہوئے اور ایک کم دو سو چالیس صفحات پر مشتمل ان کا ناول آتماؤں کے سراب منظر عام پر آ گیا ناول کا پہلا صفحہ ہی بیان کے لحاظ سے سجا سنورا تھا کہ جس میں یہ صفت کارفرما تھی کہ اس میں ایک سحر کے رنگینی تھی اور جیسے جیسے آگے بڑھا یہ لگا کہ ناول شعور کی رو میں لکھا گیا اور اس تکنیک میں قرات کے لئے خاص لطف ہے۔

نقوی صاحب اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو اس ناول میں محکمۂ جنگلات کے آفیسر کے طور پر پیش کیا گیا ہے اسی مرکزی کردار کے اطراف کہانی کا اساطیری ماحول تیار کیا گیا ہے۔ اور خاص کر اس ناول میں ابتداء میں ہی مکڑی کا بیان کو اقتدار کی کمزوری کو علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ ناول میں گنگا کی بیٹی گومتی ہے ابھے جوشی ہیں چندن ہیں کومل ہے رفعت ہے چندن ہے بنواری اور سلمیٰ کے کردار کے ذریعہ موجودہ سماج کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

ناول کا اسلوب روش عام سے ہٹ کر ہے الفاظ اکثر موسیقی ریز ہیں جس کے ہوتے قاری کو صفحات پلٹنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور ایسے اظہار سے تخلیق میں دلکشی بہر حال پیدا ہوتی ہے

ناول نگار کو ماضی پر رنج ہے حال سے مایوس ہے اور مستقبل سے ایک امید موہوم ہے قصہ سرابوں کے مایا جال میں ختم ہوتا ہے۔ بہت سی روحوں کی کربناک صدائیں ابھر اور ڈوب رہی ہیں

ناول کا اختتام تلخ حقایق کے روح فرسا بیان سے چندن اور رفعت نے ایک زمانے سے بچھڑے دو اپنوں کی طرح بہت سی باتیں کیں چاندی کی چاندنی اور بیتے دنوں کی

تغیر زمانہ کیا دن دکھاتا ہے یہ سینۂ فطرت کا راز ہے اور آتمائیں بھی راز سر بستہ ہیں انسانی ذہن اس کا ادراک نہیں کر سکتا اور وہی سراب ہے۔ زبان شاعرانہ ہے لہجہ دھیما ہے کرداروں کی مناسبت سے مکالمے انگریزی میں بھی ہیں اور خالص دیہاتی زبان میں بھی ہیں۔

راجیو پرکاش کی تخلیقی کائنات میں اشراق فتح مندی کا نظارہ یہ ناول کرا رہی ہے ان میں جزبہ بے اختیار شوق ہے جس سے نکلنے والا ہر راستہ کامیابی کی طرف جاتا ہے۔

□□□

کوائف

نام کتاب : آتماؤں کے سراب
مصنف : راجیو پرکاش ساحر
ضخامت : 239 صفحات
ناشر : میٹرلنک پبلشر، اندرانگر لکھنؤ
مبصر : سہیل کاکوروی

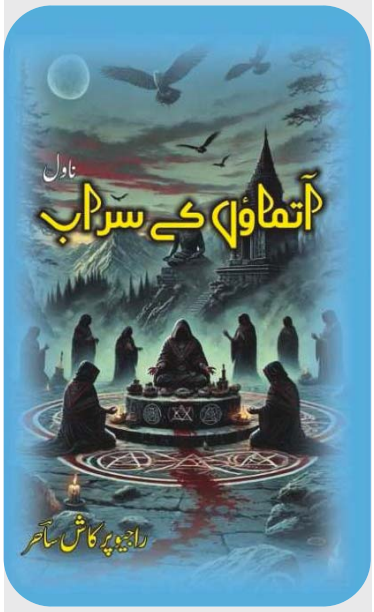

ہشام غزالی

عمر ہاؤس، مولوی گنج، امین آباد، لکھنؤ

7007906923

ترقیات

بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائیڈز کی ڈائمنڈ جوبلی

بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائیڈز کی ڈائمنڈ جوبلی اور 19ویں راشٹریہ جمبوری کی اختتامی تقریب 28 نومبر 2025 کو لکھنؤ، اتر پردیش میں کامیابی سے منعقد ہوا۔ اس شاندار تقریب میں بھارت کی صدر عزت مآب محترمہ دروپدی مرمو، اتر پردیش کی گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل، اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے شرکت کی۔

نوجوان ملک کے مستقبل کے معمار اور ثقافت کے محافظ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے، صدر محترمہ دروپدی مرموجی نے نوجوانوں کو ملک کا مستقبل کا معمار اور ثقافت کا محافظ قرار دیا۔ انہوں نے اس بات پرزور دیا کہ: بھارت کا ہدف سال 2047 تک ترقی یافتہ بھارت بننے کا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب 35 سال سے کم عمر کی 65 فیصد نوجوان آبادی اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے پختہ عزم کے ساتھ کوشش کرے۔

نوجوانوں کو با اختیار بنانے اور ان کی توانائی کو قوم کی تعمیر کے بامقصد کاموں سے جوڑنے کے لیے حکومت کی پہل، جیسے 'میرا یوا'، اہم ہے۔ بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائیڈز گزشتہ 75 برسوں سے ملک کے نوجوانوں کو صحیح سمت دینے، انہیں باضابطہ بنانے، اور انہیں قومی تعمیر میں فعال شرکت کے لیے حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ انہوں نے بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائیڈز کی خدمت کے جذبے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ سیلاب، زلزلہ، وبائی امراض جیسی آفات میں ہمیشہ امداد کے لیے سب سے آگے کھڑے نظر آتے ہیں۔

صدر محترمہ نے بتایا کہ اس تنظیم میں 63 لاکھ سے زیادہ اسکاؤٹس اینڈ گائیڈز ہیں، جن میں 25 لاکھ سے زیادہ گائیڈز (لڑکیاں) شامل ہیں، جو ایک قابل ذکر کامیابی ہے۔ 19ویں راشٹریہ جمبوری: اتحاد اور خدمت کا پیغام 19ویں قومی جمبوریہ نے بھارت کی نوجوان توانائی اور قومی اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کے مطابق، جمبوری پروگرام کی تھیم وزیر اعظم نریندر مودی

جی کے وژن کے مطابق ترقی یافتہ نوجوان، ترقی یافتہ بھارت تھی۔ انعقاد: یہ جمبوری اتر پردیش میں 61 سال کے بعد منعقد کی گئی تھی۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اس پروگرام نے پریاگ راج مہا کمبھ- 2025 کی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ اس میں ملک بھر کے 35,000 سے زیادہ نوجوان اور 25 ممالک کے تقریباً 2,000 اسکاؤٹس اینڈ گائیڈز نے حصہ لیا۔ گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل جی نے کہا کہ جمبوری نے بھارت کی ثقافت، خدمت، اور اتحاد کا پیغام دیا ہے، اور خود انحصار، سودیشی بھارت، سوچھ اور ترقی یافتہ بھارت کے جذبے کو عملی جامہ پہنایا ہے۔

ماحولیاتی دوست اور بااختیار بنانا صدر محترمہ نے اس جمبوری کو گرین جمبوری بتایا، جہاں ماحول دوست اقدامات کیے گئے، جیسے: کمپوسٹنگ فضلہ کی علیحدگی پلاسٹک فری کیمپس پلاسٹک گورنر نے نوجوانوں کی توانائی، جوش و خروش، اور مثبت سوچ کو قوم کا سب سے بڑا سرمایہ قرار دیا اور کہا کہ اسکاؤٹنگ نہ صرف مہارتیں دیتی ہے بلکہ ہمدردی، وفاداری، ہمت، اور انسانیت جیسی اقدار کی ڈھال بھی فراہم کرتی ہے۔ اختتامی تقریب کا اختتام مختلف ممالک، ریاستوں، اور تنظیموں کے اسکاؤٹس اینڈ گائیڈز کی ٹیموں کے ذریعے کیے گئے مارچ پاسٹ اور صدر محترمہ کی طرف سے لی گئی سلامی کے ساتھ ہوا۔ تقریب میں 'ایک بھارت شریشٹھ بھارت' تھیم پر ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے گئے۔ یہ جمبوری بھارت کی نوجوان طاقت کو ملک کے روشن مستقبل کے لیے تیار رہو کے نصب العین کو اپنانے کی ترغیب دیتی ہے۔ کیا آپ 19ویں قومی جمبوری میں ہونے والے پروگراموں یا کسی خاص مقرر کی تقریر کے بارے میں مزید معلومات جاننا چاہیں گے؟

□□□

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ "پی اے سی رائزنگ ڈے" کے موقع پر پولیس کے اعلیٰ افسران کے ساتھ گروپ تصویر۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ، کابینہ وزیر جناب نندگوپال گپتا نندی اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے۔

वर्ष : 79 अंक 9
जनवरी, 2025
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए **विशाल सिंह**, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **आशिया ख़ातून**